لا يبقى على ظهر الأرض بيت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام بعز عزيز وذل ذليل

زمین کی پشت پر مٹی یا گارے کا بنا ہوا کوئی گھر باقی نہیں رہے گا مگر اللہ تعالیٰ اس میں کلمہ اسلام کو داخل کردے گا۔ عزت دار کو عزت بخش کر اور ذلیل کو ذلت دے کر۔ (مسند احمد 32876، 4/6)

فکر و نظر کے دریچے

دُنیائے اسلام کے حوالے سے پچاس مسائل پر
بے لاگ تبصرہ و تجزیہ

کالم نگار
مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی
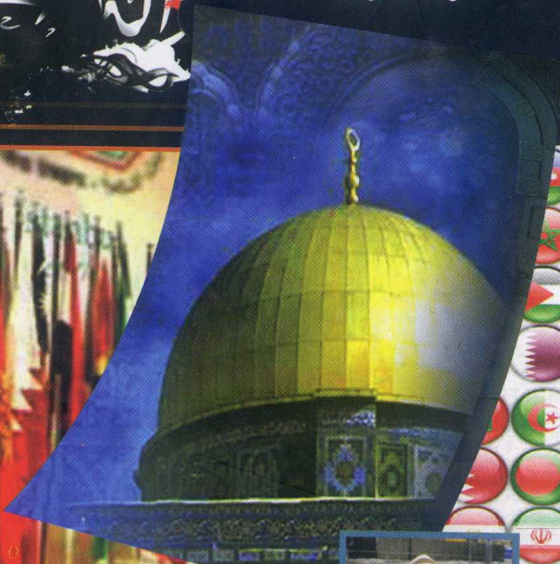
دار الاسلام

شرفِ انتساب

اُردو صحافت کی قدر کرنے والوں

کے نام

جن کی حوصلہ افزائیوں سے

چمنستانِ اُردو میں

صحافت کے پھول کِھلے ہوئے ہیں

غلام زرقانی

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ　　اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

فیضانِ نورِ علم

امامِ اعظم علی الاطلاق مؤسس فقہ حنفی ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کوفی رحمۃ اللہ علیہ

اِمامِ المتکلمین مسد ضلائل المبطلین مصحح عقائد المسلمین ابو منصور محمد ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ

غوثِ اعظم شیخ طریقت حضرت سیّد محی الدین عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

امامِ ربانی مجددِ الفِ ثانی حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ

برکۃ المصطفیٰ فی الہند شیخ محقق حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الاسلام والمسلمین اعلیٰ حضرت اِمامِ اہلِ سُنّت شاہ احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

میر مجلس

نازِشِ ملتِ اِسلامیہ، محدثِ عصر، محقق عبقری، سماحۃ الشیخ

علامہ غلامِ رسول سعیدی حفظہ اللہ

دار العلوم نعیمیہ، کراچی

اعیانِ مشاورت

اِرشاد احمد عارف، قاضی مصطفیٰ کامل، خوشتر نورانی، علی سجاد رانا

خالد محمود قادری، عمران حسین چوہدری، محمد نواز کھرل، محمد احمد ترازی، محمد اسمٰعیل بدایونی

ناظمۃ الامور	مؤسس و مدیر	صاحب الارشاد
انعم شہزادی (ایم فل سکالر)	محمد رضاء الحسن قادری	مفتی غلام حسن قادری

ضابطہ و دستور

سلسلہ مطبوعات: 22 طبع: ربیع الاول 1435ھ/ جنوری 2014ء، قیمت: 140 روپے NET

شرفِ اِنتساب

اُردو صحافت کی قدر کرنے والوں

کے نام

جن کی حوصلہ افزائیوں سے

چمنستانِ اُردو میں

صحافت کے پھول کھلے ہوئے ہیں

غلام زرقانی

مشمولات

آغازیہ

کیا اب بھی اس حقیقت کی تصدیق نہ کروں کہ انسان کبھی کبھی وادیِ حیات کے ایسے زاویے کی طرف نکل پڑتا ہے، جس کے بارے میں پہلے سے نہ کوئی ارادہ ہوا اور نہ ہی اس حوالے سے کوئی تگ ودو، اور کہنے دیجیے کہ زیر نظر کتاب متذکرہ فکر کے لیے تجرباتی صداقت کا درجہ رکھتی ہے۔

دو سال قبل اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں دہلی ہوتے ہوئے جمشید پور کا سفر ہوا۔ واپسی پر مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی کی خدماتِ جلیلہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے مقصد سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم میں ہونے والے کل ہند سیمینار میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اسے اتفاق کہیے کہ اس سیمینار سے خطاب کرنے والوں میں شمالی ہند سے نکلنے والے موقر روزنامے ''انقلاب'' کے ایڈیٹر محترم شکیل شمسی صاحب بھی تھے۔

یہ درست ہے کہ شمالی ہند کے پس منظر میں روزنامہ 'انقلاب' کی عمر زیادہ نہیں ہے، لیکن گذشتہ ۷۵ سالوں سے 'انقلاب' عروس البلاد ممبئی میں اردو داں طبقے میں قبولیت عام کی سند سے مشرف ہے۔ اس لیے یہ کہنا حقیقت کی ترجمانی ہے کہ 'انقلاب' کے نام سے شمالی ہند کے لوگ بہت پہلے سے آشنا تھے، شمالی ہند سے بھی اسے جاری کیے جانے کا فیصلہ اردو کے زلفِ نازک کے اسیروں کے لیے مژدۂ جاں فزا ثابت ہوا۔ اور جوں ہی یہ مسرت آگیں تصور حقیقت کے روپ میں آنکھوں کے سامنے جلوہ افروز ہوا، تو نہایت ہی قلیل عرصے میں اسے نہ صرف دہلی خوب صورت یوپی کے کئی شہروں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی اسی نا قابل انکار حقیقت کا دوسرا رخ ہے کہ شمالی ہند سے شائع ہونے والے 'انقلاب' کو جناب شکیل شمسی صاحب کی بے باک ادارت کا شرف میسر آیا اور ڈاکٹر افضل مصباحی جیسے فرض شناس اور مخلص ریذیڈنٹ ایڈیٹر کا تعاون بھی ملا۔ پھر تو دیکھتے ہی دیکھتے

انقلاب عوام وخواص ہر دو طبقے میں اس حد تک مقبول ہو گیا کہ اب کسی اردو خواں سے یہ
پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں کہ انقلاب کے نام سے واقف بھی ہو یا نہیں، بل کہ کوئی اگر
پوچھنے پر تل ہی گیا ہے تو اسے حیرت واستعجاب کے ساتھ یہ پوچھنا چاہیے کہ ایک طرف تم
اردو سے محبت کا دعویٰ بھی کرتے ہو اور دوسری طرف انقلاب سے واقف بھی نہیں!

اسی سفر میں ڈاکٹر افضل مصباحی صاحب سے ملاقات کے دوران میں نے اپنی
ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ ''آیات'' کا ایک انھیں نسخہ پیش کیا۔ موصوف
نے اپنے انداز میں میرے اداریہ کی تحسین فرمائی اور اسے جناب شکیل شمسی صاحب کو بھی
دکھایا۔ اداریے میں عالم عرب کے حالیہ واقعات کی ترجمانی جس اسلوب میں کی تھی، وہ
موصوف کو بھا گئی اور مجھ سے انقلاب کے لیے لکھنے کی فرمائش کر ڈالی۔ مجھ سے انکار نہ بن
پڑا اور میں نے کوشش کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے رخصت چاہی۔

اسے احباب کی حسن توجہ کہیے کہ ہالینڈ کے مختصر دورے کے بعد ہیوسٹن پہنچنے پر اپنے
وعدے کی تکمیل کے لیے جب کوشش کی، تو چند سطریں نوکِ قلم پر آ ہی گئیں اور اس طرح یہ
سلسلہ بہ عنوان ''پس پردہ'' ہر ہفتے کے شمارے کی زینت بننے لگا۔ بہت ممکن تھا کہ یہ آغاز جلد
ہی اپنے اختتام کو پہنچ جاتا، لیکن آئے دن قارئین کی پذیرائیاں اور مبارک بادیاں میرے
حوصلوں میں نئی روح پھونکتی رہیں اور میں پابندی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ ایک دن
اچانک پیچھے پلٹ کر دیکھا تو لگا کہ واقعی لکھتے لکھتے پورے ایک سال بیت چکے ہیں اور
مضامین کا ایک معتد بہ ذخیرہ تیار ہے۔

چوں کہ انقلاب ابھی بہار، جھارکھنڈ اور بنگال کے علاقوں سے شائع نہیں ہوتا ہے،
اس لیے ان علاقوں کے احباب نے مشورہ دیا کہ ان مضامین کو یک جا کر کے شائع کر دیا
جائے تو بہتر ہو۔ میں نے جب سنجیدگی کے ساتھ غور کیا تو مجھے مشورے میں بہت حد تک دم
نظر آیا اور پھر اسے ترتیب دینے کی کوشش شروع کر دی۔

قارئین میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ 'پس پردہ' کے عنوان سے لکھے گئے
مضامین صرف حالات حاضرہ پر تعمیری تبصرے تک محدود نہیں ہوتے، بل کہ کوشش ہوتی ہے

کہ متعلقہ موضوع کے حوالے سے تاریخی پس منظر کی سرسری جھلک، اور اس کے داخلی و
خارجی عناصر کی ایک ممکنہ تصویر بھی نگاہوں کے سامنے رہے، تاکہ گفت گو کی اوٹ سے
جھانکنے والے مقصد تک پہنچنے میں دیر نہ لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے بیش تر مضامین
بڑے ہی تحقیقی، علمی، تاریخی اور واقعاتی پس منظر میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ حتمی اعتبار سے یہ مضامین کسی فصل بندی کے مستحق نہ تھے، لیکن
قارئین کی سہولت کے لیے انھیں مختلف فصلوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلی فصل میں یورپ و
امریکہ کے حوالے سے، دوسری میں عالم عرب، تیسری میں برصغیر پاک و ہند، چوتھی میں
عالم اسلام اور پانچویں میں عالمی دنیا کے بارے میں گفت گو کی گئی ہے۔ لیکن ان کے
درمیان یہ قدرِ مشترک ضرور ہے کہ ان کے سرے کسی نہ کسی زاویے سے بہ ہر حال ''اسلام
اور مسلمانوں'' کے حالات وواقعات سے ہی ملتے ہیں اور کیوں نہ ملیں کہ میری تمام تر جدو
جہد، تگ ودو اور بحث ونظر کا محور ومرکز دین اسلام ہی ہے اور رہے گا۔

میں صمیم دل کے ساتھ جناب شکیل شمسی صاحب ایڈیٹر انقلاب برائے شمالی ہند کا شکر
گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کتاب کے لیے اپنے
احساسات سپردِ قلم کیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ شمالی امریکہ سے نکلنے والے موقر ہفتہ وار
''پاکستان نیوز'' کے بیورو چیف جناب شمیم سید صاحب کے لیے شکریہ کے الفاظ نوکِ زبان
پر ہیں کہ انھوں نے بھی بڑی محبتوں کے ساتھ اس کتاب کو اپنی قیمتی سطروں سے مشرف کیا،
بل کہ اس کرم فرمائی کے لیے بھی میں ان کا مشکور ہوں کہ 'پس پردہ' کے عنوان سے شائع
ہونے والے بعض مضامین کو انھوں نے اپنے اخبار کے ذریعہ امریکہ کے دسیوں شہروں کے
اردو قارئین تک پہنچایا۔ اخیر میں اپنی شریکۂ حیات کے لیے بھی دعائیہ کلمات کہ انھوں نے
بچوں کی تربیت کی ذمہ داریوں سے چند لمحے نکالتے ہوئے ہر مضمون کے بھیجنے سے پہلے
بڑی توجہ کے ساتھ پروف ریڈنگ کی اور مفید مشورے بھی دیے۔

غلام زرقانی قادری

ہیوسٹن، امریکہ - ۲۵؍ مارچ ۲۰۱۳ء

ڈاکٹر غلام زرقانی کا اُسلوبِ تحریر اور فکری تنوع

علی سجاد رانا
ایڈیٹر: سلسلہ وار اخبار ''صدائے قبلتین''، لاہور-پاکستان

ڈاکٹر غلام زرقانی کی کتاب ''فکر و نظر کے دریچے'' آپ کے ہاتھ میں ہے جو عالم اسلام کے حوالے سے ۵۰ مختلف موضوعات پر مشتمل فکر و نظر کا واقعی اکسیر ہے۔ کتاب ڈاکٹر غلام زرقانی کے ان کالمز، مضامین کا مجموعہ ہے جو بھارت کے روزنامہ ''اِنقلاب'' میں چھپ چکے ہیں۔ روزنامہ ''اِنقلاب'' شمالی ہند کے کم و بیش ۱۰ ارشہروں سے تواتر کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ کالمز کے عنوانات کا تنوع ہی اس بات کا غماز ہے کہ ڈاکٹر غلام زرقانی کس گہرائی کے ساتھ اقوامِ عالم کا مشاہدہ و مطالعہ کرتے ہیں۔ اور پھر کن باریک بینوں کے ساتھ حالات کا تجزیہ کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جس سے قاری نہ صرف معلومات حاصل کرتا ہے بل کہ بڑی حد تک ذہنی پختگی اور فکری صلابت حاصل کرتا ہے۔

ڈاکٹر غلام زرقانی سے متعارف ہونے کا سبب آپ کی تحریریں ہی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مکتبہ دار الاسلام کے ڈائریکٹر محمد رضاء الحسن قادری نے ایک دفعہ مجھے اخبار ''صدائے قبلتین'' میں چھپنے کے لیے ان کی تحریریں دیں، تحریروں کے اخبار میں شائع ہونے سے ان کا بہت اچھا رسپانس رہا۔ بعد ازاں مکتبہ دار الاسلام نے ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کو چھاپنے کا اِرادہ کیا تو ایک دن محمد رضاء الحسن صاحب نے مسودہ مجھے تھما دیا اور کچھ لکھنے کا کہا، بس ان کے حکم پر مَیں نے کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور جو کچھ اخذ کر سکا وہ اپنے تاثرات کے انداز میں آپ تک پہنچا رہا ہوں۔

کتاب میں جہاں مغرب کے اِمتیازی سلوک کا تذکرہ کیا گیا ہے وہاں مشرق کے رویوں کے کھردرے پن کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اگر ایک ایک موضوع پر تبصرہ کیا جائے تو یہ باقاعدہ نقد و نظر کے موضوع پر ایک کتاب بن جائے۔ بہرحال ڈاکٹر غلام زرقانی اتنے اہم اور ادق موضوعات کو اتنے عام اور سادہ فہم انداز میں بیان کر جاتے ہیں کہ قاری ۳ صفحے کا ایک آرٹیکل پڑھنے کے بعد ۳ ماہ تک سوچتا رہتا ہے۔ زورِ استدلال اتنا دل نشیں ہے کہ ایک بات کو سمجھنے کے لیے نہ تو کسی استاد کے پاس جانا پڑتا ہے اور نہ کسی لائبریری میں جا کر ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کی زحمت گوارا کرنا پڑتی ہے۔

ایک اہم بات جو ڈاکٹر غلام زرقانی کی تحریروں سے عیاں ہے وہ یہ ہے کہ ان کی تحریر پڑھنے کے بعد قاری ایک نتیجے پر پہنچ جاتا ہے اور تحریر قاری کو سوچنے اور کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسلوبِ تحریر فطرت کے اتنا قریب ہے کہ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ تو میری ہی بات کر رہے ہیں، ایک ایک مضمون کو کئی کئی مرتبہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ ڈاکٹر زرقانی کے قلم سے نکلنے والے الفاظ میں جہاں سلاست ہے وہاں ایک فکری پختگی بھی موجود ہے۔ وہ ایک فرد بن کر نہیں، بل کہ جماعت بن کر سوچتے ہیں۔ وہ راہ گزر میں رہنے اور قیدِ مقام کی حد بندیوں سے باہر نکل کر سوچتے اور لکھتے ہیں، اپنوں کی غلطیوں کی اِصلاح اور دوسرے کے متعصبانہ رویوں کو اس خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے میں خود ہی شرمندگی کا اِحساس ابھرنے لگتا ہے۔ وہ ایک نام ور قلم کار، بہترین استاد اور اعلیٰ درجے کے منتظم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہندوستان کے رہائشی اور آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔ آپ قائدِ اہل سنت علامہ ارشد القادری ؒ کے لختِ جگر ہیں۔ آپ حجاز فاؤنڈیشن آف امریکہ، ہیوسٹن کے بانی و چیئر مین ہیں۔ مشرق و مغرب کا حصہ ہونے کے سبب مسلم و غیر مسلم نفسیات کو قریب سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ جہاں جہاں بے قاعدگیاں اور جھول نظر آتا ہے انھیں بڑی خوب صورتی سے قلم و قرطاس کی زینت بناتے ہیں۔ واقعات اور حادثات کا اس خوب صورتی سے تجزیہ کرتے ہیں کہ ایک واقعہ کی ایک ایک جزئی آپ کے سامنے آشکار ہو جاتی ہے۔ آپ ایک طرف مسجد، مدرسہ، گھر اور معاشرے کی بات

کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف قوموں کے اجتماعی رویوں اور امنِ عالم کو تباہ کرنے والے عوامل کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ اکثر وبیش تر صرف مسائل کی نشان دہی ہی نہیں کرتے بل کہ ان کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔

یہ کتاب پہلے انڈیا میں دار الکتاب، دہلی سے چھپ چکی ہے اور اب پاکستان میں مکتبہ دار الاسلام یہ سعادت حاصل کر رہا ہے۔ مکتبہ دار الاسلام پہلے بھی ایسی کئی فکری کتابیں شائع کر چکا ہے جو تاریخ کا حصہ ہیں۔ مکتبہ دار الاسلام کے ڈائریکٹر محمد رضاء الحسن قادری متحرک فکر اور بیدار مغز پبلشر ہیں۔ وہ لوگوں کے چند ستائشی فونوں پر خوش ہو کر تخمین وظن لگانے والے نہیں بل کہ کتاب جوئی میں جہانیاں جہاں گشت کی سی طبیعت کے مالک ہیں، وہ داخلی موضوعات کے ساتھ ساتھ خارجی موضوعات پر مخالف افراد سے موازنہ کرنے کے بعد کتابوں کو مارکیٹ میں لانے کی سعی کرتے ہیں، وہ ہواؤں کے رخ چلنے کے بہ جائے ہواؤں کے رُخ موڑنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور کئی مرتبہ انھوں نے خود کو ایسا ثابت بھی کر دیا ہے۔ وہ نوجوانوں کی امید ہیں، رابطوں کا ایک جہان ہیں، اس لحاظ سے مَیں تو انھیں اس دور کا حکیم محمد موسیٰ امرت سری ہی کہوں گا، جو لوگوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر غلام زرقانی کی کتاب کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ اور پاکستان میں بسنے والے زیادہ سے زیادہ افراد اس کتاب سے مستفید ہو سکیں۔ مَیں اس کام یاب کوشش پر ڈاکٹر غلام زرقانی اور محمد رضاء الحسن قادری کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور کتاب کی قبولیت اور فروخت کی خوش خبری سناتا ہوں۔

ادارتی نوٹ: کتاب ہذا مصنف کے افکار کا پرتو ہے، بعض جگہوں پر مختلف لوگوں کو اعتراض بھی ہو سکتا ہے، اس لیے کتاب کو صرف مصنف کے افکار کی روشنی میں پڑھا جائے، پبلشر کا اس سے کلی اتفاق ضروری نہیں۔ خاص طور پر دو ایک جگہ پاکستان کے حوالے سے کالم نگار کا قلم توازن کھو بیٹھا ہے یا اگر اسے حسن ظن پر محمول کیا جائے تو اسے "سیاسی انداز" کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر زرقانی کی تحریریں

فخرِ صحافت شکیل شمسی صاحب

ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب" (برائے شمالی ہند)

شمالی ہندوستان سے ۲۷ مئی ۲۰۱۱ء کو جب روزنامہ "انقلاب" نکلنا شروع ہوا اور مجھے اس کی ادارت سونپی گئی، تو کچھ ہی عرصے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے انصاری آڈیٹوریم میں مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی کی یاد میں ایک پروگرام میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اسی تقریب میں ایک جواں فکر مقرر سے میرا تعارف ہوا۔ میں زبان اور موضوع پر ان کی گرفت سے بے انتہا متاثر ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف کو ڈاکٹر غلام زرقانی کہتے ہیں، جو امریکہ کے شہر ہیوسٹن کے "لون اسٹار کالج" میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ میں نے ڈاکٹر غلام زرقانی صاحب سے گزارش کی کہ وہ ہمارے اخبار کے لیے کالم لکھیں، تو وہ بہ خوشی راضی ہو گئے۔ اس کے بعد سے آج تک ڈاکٹر صاحب روزنامہ انقلاب کے مستقل کالم نگار ہیں اور ان کا کالم شمالی ہند کے گیارہ شہروں سے شائع ہونے والے ایڈیشن میں شامل اشاعت کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب عام طور پر امریکہ اور مسلم ممالک کے موجودہ حالات پر کالم تحریر کرتے ہیں۔ دینیات ان کا خاص موضوع ہے۔ زیر نظر ان کی کتاب "فکر ونظر کے دریچے" انقلاب میں شائع شدہ فکر انگیز مضامین کا مجموعہ ہے، جو کتابی شکل میں آ جانے کے بعد یقینی طور پر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر زرقانی صاحب امریکہ میں رہتے اور لون اسٹار کالج میں تدریسی فریضہ انجام دے رہے ہیں، ساتھ ہی اردو، عربی، انگریزی اور فارسی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں،

اس لیے ان کے کالم میں زبان وبیان اور مواد کی وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں، جو ایک اچھے کالم نگار سے متوقع ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک باصلاحیت عالم دین بھی ہیں، دینیات پر ان کی گرفت اچھی ہے، اس لیے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ قارئین ان کی تحریر پڑھ کر سبق حاصل کریں۔ وہ عام طور پر اپنے کالم میں مسلمانوں کے کسی نہ کسی مرض کی تشخیص کرتے ہیں اور پھر اس کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں۔ وہ عالمی برادری کی طرف سے مسلمانوں پر ہو رہی زیادتی کو بھی اکثر وبیش تر نشانہ بناتے رہتے ہیں اور دنیا کے جن ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ عصبیت برتی جاتی ہے، اس کو وہ بلاخوف وخطر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور عالمی برادری کی توجہ بھی اس جانب مبذول کراتے ہیں۔ موصوف کے کالم کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا آسان ہے کہ وہ اپنی تحریر کو زبان دینے میں پوری طرح سے کام یاب ہیں اور قارئین یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ تحریر کو پڑھ نہیں رہے ہیں، بل کہ کسی کہنہ مشق واعظ سے فکر انگیز خطاب سماعت کر رہے ہیں۔ یہ خوبی بہت کم قلم کاروں کے حصے میں آتی ہے۔ میری یہ بات ان کے مضامین میں استعمال ہونے والے لفظ ''صاحبو'' سے بہت واضح ہے۔

ڈاکٹر زرقانی صاحب کے موضوعات میں خصوصیت کے ساتھ شام، یمن اور مصر کے حالات، سعودی عرب کے احوال، یورپ وامریکہ میں مسلمانوں کی صورت حال، لیبیا کی سیاسی اور سماجی صورت حال، مسلم ممالک کے حکم رانوں کا افسوس ناک طرز عمل کے علاوہ، ہندوپاک کے احوال اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور مذہبی احوال ہیں۔ موصوف کی تحریر پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے لیبیا اور دیگر ملکوں میں تعلیم حاصل کی ہے، اسی لیے وہ ان ممالک کی مشاہداتی مثالیں بھی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کی مذہب سے دوری پر وہ انتہائی افسردہ خاطر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے کالم میں کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو اتحاد کا درس دیا جائے، اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی جائے، اخلاقیات پر وہ خاص طور سے زور دیتے ہیں اور اس کے لیے وہ جہاں پیغمبر اسلام ﷺ، اہل بیت اطہار، اصحاب کرام اور بزرگوں کی مثالیں پیش کرتے ہیں، تو دوسری

طرف مغربی ممالک میں رہنے والے موجودہ شہریوں کے مستحسن اقدامات کی مثالیں دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ ان کا ماننا ہے کہ جو خاصیتیں مسلمانوں کی تھیں، انھیں غیروں نے اپنا لیا ہے، اور جو مخرب اخلاق تہذیب وتمدن غیروں کے ہیں، انھیں مسلمان تیزی کے ساتھ گلے لگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری قومیں کام یاب ہیں اور ہم خائب وخاسر ہو رہے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ مسلمان اس وقت تک پورے طور پر کام یاب نہیں ہو سکتے، جب تک اسلامی تعلیمات پر مضبوطی کے ساتھ عمل پیرا نہ ہوں۔ ٹیری جونس کی ناپاک حرکت پر ڈاکٹر صاحب نے امریکہ میں رہ کر جس بے باکانہ انداز میں اپنے رد عمل کا اظہار کیا ہے، یہ جرأت کوئی انصاف پسند کالم نگار ہی کر سکتا ہے۔ موصوف بسا اوقات اپنی تحریروں میں مختلف ممالک کے اسفار کے تجربے بھی شامل کرتے ہیں، جس کے پس پردہ قارئین کو وہاں کے حالات سمجھنے میں بہت حد تک مدد ملتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں ان کی تحریریں دیکھ کر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا کوئی مضمون بھی ایسا نہیں تھا جو صبح کو اخبار کے کالم کی زینت بنتا اور شام کو ردی ہو جاتا، بل کہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی تحریریں ایک دستاویز کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔

مجموعی طور پر ان کی بیش تر تحریریں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ میں دعا گو ہوں کہ جس طرح انقلاب کے قارئین بہت ہی ی کے ساتھ ان کے کالم کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، اسی طرح اس کتاب کے قارئین بھی استفادہ کریں گے۔

علامہ زرقانی کی بے باکی

آبروے صحافت شمیم سیّد صاحب
بیورو چیف "پاکستان نیوز"، امریکہ

یہ میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ میں علامہ ڈاکٹر غلام زرقانی صاحب کے لکھے ہوئے کالموں پر اظہار خیال کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے جس محنت کے ساتھ ہیوسٹن کی سرزمین پر "حجاز فاؤنڈیشن آف امریکہ" کی بنیاد ڈالی اور اس کے بینر تلے مسجد، مدرسہ، مرکز دعوت وتبلیغ اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ "حجاز اکیڈمی" کے نام سے اسکول کا آغاز کیا ہے، وہ ان کی ذہانت وفطانت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ باوجود مخالفتوں کے وہ اپنے ادارے کے استحکام وترقی کے لیے ڈٹے رہے اور بالآخر خدمت اسلام کے حوالے سے اپنے خوابوں کی تعبیر روئے زمین کے سینے پر منتقل کر کے ہی دم لیا۔ اس طرح انھوں نے امریکہ کی سرزمین پر نئی نسل کو دین اسلام سے قریب رکھتے ہوئے دنیاوی کامیابی کے لیے تیار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

جہاں تک علامہ زرقانی صاحب کی علمیت کا تعلق ہے، تو انھوں نے برصغیر کے ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی ہے۔ ان کے والد گرامی قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ کا شمار صف اول کے علمائے اسلام میں ہوتا ہے، جو صاحب طرز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ نکتہ رس خطیب، کامیاب مناظر اور ہندوستان اور بیرون ہند سینکڑوں مدارس، مساجد اور اسکولوں کے بانی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کی شہرہ آفاق کتاب "زلزلہ" نے پورے عالم اسلام میں دھوم مچادی تھی۔ لہٰذا ایسے خانوادے کی گود میں پلنے بڑھنے

والے کے اندر ایسی صلاحیتیں کیوں نہ ہوں۔ جب میں نے کتاب کا مسودہ دیکھا جو کہ ۲۴۸/ صفحات پر مشتمل تھا، تو میں نے دل میں سوچا کہ جس نے اتنا کچھ لکھا ہو، ان کے بارے میں کیا لکھوں۔ علامہ زرقانی کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ ان کے یہ مضامین ہندوستان کے اخبارات میں چھپتے رہے ہیں اور ہمارے اخبار "پاکستان نیوز" کو بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ جس میں ان کے بعض مضامین چھپے ہیں اور قارئین سے پزیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ انھوں نے دنیائے اسلام کے حوالے سے پچاس مسائل پر بے لاگ تبصرہ و تجزیہ کیا ہے۔ جس میں دہشت گردی کے حوالے سے جو کالم انھوں نے لکھا ہے، وہ ان کی ہمت وبہادری پر دلالت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کولوراڈو کے سینما ہال میں ۱۱۲/ افراد کے قاتل کے بارے میں بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں قاتل نے جس پلاننگ اور مہارت کے ساتھ اپنی کارروائی کی ہے، اسے دیکھتے ہوئے اس کو دماغی طور پر نفسیاتی مریض ظاہر کرنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ہاں یہی واقعہ اگر خدانخواستہ کسی مسلمان کے ذریعہ ظہور پذیر ہوا ہوتا تو اسے سب سے پہلے دہشت گرد ثابت کیا جاتا اور پھر ان تھک کوششیں کی جاتیں کہ اس کے ظالمانہ اقدام کو اسلام کی بنیادی تعلیمات کا براہِ راست نتیجہ قرار دیا جائے، تاکہ کسی بھی طرح اسلام کے پاکیزہ چہرے کو داغ دار کیا جا سکے۔ اسی طرح ایک مضمون جس کا عنوان کچھ اس طرح ہے کہ غیر تو اپنے دہشت گردوں کو بھی دہشت گرد نہیں کہتے اور ہم ہیں کہ اپنے سیاسی مخالفین کو دہشت گرد کہتے نہیں تھکتے۔ ڈاکٹر صاحب بڑی بے باکانہ بات کرتے ہیں چاہے کسی کو بری لگے۔ ذرا دیکھیے تو سہی کہ انھوں نے کس قدر خوب صورت جملہ تحریر کیا ہے کہ مسلمانوں کے دامن میں لگے ہوئے دہشت گردی کے بدنما داغ کی پرورش میں صرف غیروں کا ہاتھ نہیں ہے، بل کہ ہمارے اپنے بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ پھر بڑے ہی فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے صاف وشفاف دامن میں لگا ہوا یہ دھبہ اس وقت تک نہیں مٹ سکتا، جب تک ہم خود اس کی پرورش نہ کرنے کی قسم نہ کھالیں۔

علامہ زرقانی صاحب کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ انھیں دینی معلومات کے ساتھ ساتھ

تمام دنیا میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بھی بخوبی علم رہتا ہے اور وہ گاہے بہ گاہے اپنے کالموں کے ذریعہ اِن کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے امریکی صدر باراک اوبامہ کے خاندانی حالات پر بھی ایک کالم لکھا ہے۔ موصوف نے بعض ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جو عالم اسلام میں بڑے حساس سمجھے گئے اور جن کے خلاف غم وغصہ کے اظہار کے لیے لاکھوں کی تعداد میں مسلمان سڑکوں پر اتر آئے۔ جیسے امریکہ فوجی نصاب میں اسلام مخالف مواد کی شمولیت کے حوالے سے بحث، اہانتِ رسول ﷺ کی نیت سے بنائی گئی دل آزار فلم اور ٹیری جونز کے ذریعہ قرآن کریم کے نذرِ آتش کرنے کی کوشش وغیرہ۔

اسی کے ساتھ ایک طرف انھوں نے یورپ وامریکہ میں مسلمانوں کے حوالے سے ہونے والے واقعات پر بھی تبصرہ کیا ہے، تو دوسری جانب عرب ممالک کے افسوس ناک حالات پر بھی قلم اٹھانے سے نہیں چوکے۔ حرمین شریفین میں توسیعی منصوبے کے نام پر بڑے بڑے بازار بنائے جانے پر بہت ہی سخت تنقید کی ہے۔ پھر برصغیر پاک وہند پر تو خوب باتیں کیں ہیں۔ سیاچن کے بارے میں علامہ نے بڑی خوب صورت بات کہی ہے کہ گذشتہ آٹھ سالوں سے دونوں طرف کی فوجوں کے درمیان ایک گولی کا بھی تبادلہ نہ ہوا، لیکن قدرتی آفات سے محاذ آرائی بہ ہر حال رہی۔ غرض کہ علامہ زرقانی نے کسی بھی شعبے کو نہیں چھوڑا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ علامہ موصوف کی تحریر میں بڑی چاشنی ہے، انداز بیان بڑا خوب صورت اور پرکشش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے تسلسل کے ساتھ لکھے ہوئے کالموں پر مشتمل یہ کتاب اہل علم اور اردو سے محبت کرنے والوں کے لیے ایک نادر دستاویز ثابت ہوگی۔

علامہ موصوف جہاں ایک طرف جامع مکہ مسجد کے خطیب ہیں، وہیں لون اسٹار کالج میں شعبۂ عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر بھی ہیں۔ اس لیے دینی ودنیاوی دونوں حالات پر ان کی گہری نظر رہتی ہے، جس کی عکاسی ان کے زیر نظر کتاب میں جگہ جگہ واضح دکھائی دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم میں اور اضافہ کرے اور وہ اسی طرح مسلمانوں میں یک جہتی اور محبت کی شمع جلائے رکھیں۔

نشیمن پر نشیمن اس قدر تعمیر کرتا جا
کہ بجلی گرتے گرتے آپ خود بیزار ہو جائے

یورپ و امریکہ

وہ تو اپنے دہشت گرد کو بھی دہشت گرد نہیں کہتے

مسلمانوں کے دامن پر دہشت گردی کے لگے بدنما داغ کو زندہ رکھنے کی کوششوں میں غیروں کے شانہ بہ شانہ اپنے بھی شریک ہیں

۲۰/جولائی ۲۰۱۲ء بہ روز جمعہ ہم شہنائی ریسٹورانٹ کے مخصوص ہال میں دوپہر کے کھانے میں مصروف تھے کہ اتنے میں دیوار پر آویزاں بڑے اسکرین پر ایک فوری خبر کی پٹی چل رہی تھی اور آس پاس پولیس کی موجودگی واضح طور پر یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ امریکہ میں کوئی بڑا حادثہ ہوا ہے۔ مَیں نے توجہ سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ امریکہ کے ایک بڑے شہر کولوراڈو کے سینما ہال میں کسی نے ''دہشت گردانہ'' کارروائی کی ہے۔ مجھے احباب نے بتایا کہ کولوراڈو کے علاقے اوروراکے ایک سینما ہال میں **"The dark night Rises"** نامی فلم چل رہی تھی۔ اسی دوران ایک شخص نے اپنی بندوق کا منہ کھول دیا اور فلم بینوں پر گولیوں کی برسات کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ۱۲/افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور تقریباً ۵۸/افراد زخمی ہوگئے۔ اخبارات کی اطلاعات کے مطابق جب تک پولیس موقعِ واردات پر پہنچتی قاتل فرار ہونے کے لیے اپنی کار تک رسائی حاصل کر چکا تھا، لیکن بڑی مستعدی اور ہوش یاری کے ساتھ پولیس اسے اپنی گرفت میں لینے میں بہ ہر حال کام یاب ہوگئی۔

اس واقعہ کے عینی شاہدین کے مطابق فلم شروع ہونے کے بیس تیس منٹ بعد اچانک ہر طرف دھواں سا محسوس ہوا۔ ہم نے سمجھا کہ شاید دورانِ فلم آتش بازی کی گئی ہے۔ پھر گولیوں کی آوازیں آنے لگیں اور اسی کے ساتھ ہر طرف چیخ و پکار سے فضا خوف ناک ہوگئی۔ ہم نے دیکھا کہ ایک نوجوان سیڑھیوں کے سہارے تیزی سے آگے بڑھتا جارہا ہے اور لوگوں پر گولیاں برساتا جارہا ہے۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں بیرونی دروازے کی طرف

بھاگ رہے تھے اور کچھ زمین پر لیٹنے کی کوشش کررہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب گولیوں کے چلنے کی آواز تھم گئی تو پھر ہم نے سر اٹھایا اور اپنے چاروں طرف دیکھا۔ لوگ خون میں لت پت تھے۔ کچھ زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور کچھ زخمی حالت میں کراہ رہے تھے۔ پولیس کے بیان کے مطابق اس حادثہ کے ملزم جیمس ہولمس نے ایک فوجی طرز کا رائفل **AR-15**، ایک مختصر نشانے کی بندوق اور دو دستی گنوں کا استعمال کیا، جب کہ وہ خود اپنے تحفظ کے لیے چہرے پر گیس ماسک پہن رکھا تھا۔

اب ذرا ملزم کے حوالے سے واشنگٹن پوسٹ میں چھپنے والی یہ رپورٹ پڑھیے:

" The suspect in the Colorado theater rampage was seeing a University of Colorado pychiatrist who studies schizophrenia, according to court records released Friday, indicating for the first time that University officials were familiar with James Holmes' mental state."

(Washington Post E-Paper, July 27)

''جمعہ کے دن مشتہر ہونے والے عدالتی ریکارڈ کے مطابق کولوراڈو سینما ہال کے مبینہ ملزم کولوراڈو یونی ورسٹی کے ماہر نفسیات کے زیر علاج تھے۔ یہ انکشاف پہلی بار اس حقیقت سے پردہ اٹھا رہا ہے کہ یونی ورسٹی انتظامیہ پہلے سے ہی جیمس ہولمس کی دماغی حالت سے باخبر رہی ہے۔''

مَیں سمجھتا ہوں کہ مندرجہ بالا اقتباس سے میرا مدعا آپ پر روشن ہوگیا ہوگا۔ ہوسکے تو اسے ایک بار پھر پڑھیے اور واردات کے لیے ملزم کی تیاریوں کا جائزہ لیجیے۔ کیا دونوں باتوں میں یکسانیت محسوس ہوتی ہے؟ بڑی تباہی کے لیے ایک نہیں کئی ایک ہتھیار سے مسلح ہونا، اپنے تحفظ کے لیے گیس ماسک پہننا تاکہ گیس کا گولہ پھینکنے کے بعد خود پر مدہوشی طاری نہ ہوسکے، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی نیت سے سینما ہال کا انتخاب، نئی ریلیز ہونے والی فلم کا انتظار تاکہ لوگوں کا ہجوم کسی قدر زیادہ ہوسکے، وغیرہ وغیرہ

اور پھر دماغی حالت کی ابتری کا لاحقہ......... ہے نا عجیب وغریب بات؟ لیکن کیا کیجیے گا کہ یہ اپنوں کی بات ہے، یہی واقعہ اگر کسی مسلمان کے ہاتھوں رونما ہوا ہوتا تو اسے سب سے پہلے ''دہشت گرد'' ثابت کیا جاتا اور پھر ان تھک کوشش کی جاتی کہ اسے ''اسلام'' کی بنیادی تعلیمات کا بہ راہِ راست نتیجہ قرار دیا جائے۔ اس طرح ایک طرف کسی ناعاقبت اندیش مسلمان کی حرکتوں کے پس پردہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ذہنی اذیت دی جا سکے اور دوسری طرف مذہب اسلام کا صاف وشفاف چہرہ بھی مسخ ہو جائے۔

یہ دورنگی کوئی نئی بات نہیں۔ جولائی ۲۰۱۱ء کی بات ہے کہ انڈریس بہیرنگ نامی ایک نوجوان نے یورپ کے ملک ناروے میں اپنے جنونی اقدام سے سبھوں کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ پریس کے نمائندوں کی رپورٹ کے مطابق سب سے پہلے اس نے **Oslo** کی سرکاری عمارت کے سامنے ایک کار میں بم نصب کیا جس کے پھٹنے سے گیارہ لوگوں کی موت واقع ہوئی۔ یہاں سے وہ **Utoya** پہنچا جہاں برسر اقتدار لیبر پارٹی کے نوجوانوں کی ایک تقریب ہو رہی تھی۔ نوجوان روایتی طرز کے عیش وطرب میں مست تھے کہ اس نے گھات لگا کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ان دونوں واقعات میں تقریباً بانوے شہری لقمۂ اجل بن گئے۔ ملزم کو گرفتار کیا گیا اور عدالت میں پیش کیا گیا۔ عام طور پر ایک ملزم جج کے رُو بہ رُو اعترافِ جرم کا انکار کر دیتا ہے تاکہ ممکنہ سزا سے بچ سکے، لیکن انڈریس نے بہ بانگ دہل اپنے سفاکانہ اقدام کا اقرار کر لیا۔ برا ہو جانب دارانہ طرزِ فکر کا کہ انڈریس کا علاج کرنے والے نفسیاتی ڈاکٹروں **Mr. Synne Serheim** اور **Mr. Torgeir Husby** نے یہ بیان دے ڈالا کہ انھوں نے باریک بینی کے ساتھ انڈریس کا طبی جانچ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسے واردات کے دنوں میں سائکاسس (**Psychosis**) نام کی شکایت ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے انسان کے فیصلے کرنے کی صلاحیت بری طرح متاثر ہو جاتی ہے اور مریض اپنے اقدامات کے حوالے سے صحیح فیصلے کرنے کی قدرت کھو دیتا ہے۔ یعنی وہی بات کہ یہاں بھی ''اپنے مجرم'' کو بچانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ جرم کرنے والے کے ''دماغی توازن'' کھو جانے کی وجہ سے مبینہ واردات وقوع پذیر ہوا ہے۔

یہ تو رہے مغربی معاشرہ میں پروان چڑھنے والے اپنے مجرموں کے حالات کہ جہاں ان کے کیے ہوئے ''سفاکانہ قتل وخون'' کے واردات کو بھی دہشت گردی نہیں کہا جاتا۔ اب ذرا اسی پس منظر میں عالم اسلام پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لیجیے۔ یہ لیبیا کی سرزمین ہے جہاں کے قائدِ انقلاب معمر القذافی نے اپنے شہریوں کو صرف اس لیے ''دہشت گرد'' کہہ ڈالا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے غیر مسلح احتجاج کر رہے تھے۔ ان پر توپوں کے منہ کھول دیے گئے۔ آگے بڑھیے! یہ یمن ہے جہاں پر برسوں سے اقتدار پر قابض ڈکیٹر کی زیادتیوں کے خلاف صف آرا ہونے والے مظاہرین کو دہشت گرد کہہ کر کچلنے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح بحرین میں ہونے والے غیر مسلح احتجاج کو دبانے کے لیے پھر اسی مکروہ لفظ کا سہارا لیا گیا۔ اور اب تازہ ترین صورت حال شام کی ہے۔ یہاں بھی ابتدا میں شہریوں نے اپنے خلاف ہونے والی مسلسل ناانصافیوں پر شکوہ ہی کیا تھا۔ وہ سڑک پر جب نکلے تو مسلح نہ تھے، لیکن نہتے مسلمانوں پر اپنے ہی لوگوں نے یہ کہہ کر توپوں کے منہ کھول دیے کہ یہ لوگ دہشت گرد ہیں۔

صاحبو! اب میری باتوں پر یقین آیا کہ غیر تو اپنے دہشت گردوں کو بھی دہشت گرد نہیں کہتے اور ہم ہیں کہ اپنے سیاسی مخالفین کو دہشت گرد کہتے نہیں تھکتے۔ غور کریں کس قدر فرق ہے ہمارے اور ان کے طرز معاملات میں، وہ تو اپنوں کے جان بوجھ کر کیے ہوئے سفاکانہ واردات کو بھی ''ذہنی علالت'' کی خوب صورت چادر سے ڈھانکنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہم اپنوں کے ''غیر مسلح احتجاج'' کو بہ بانگ دہل دہشت گردانہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میری بات کڑوی لگے گی، لیکن مجھے اس کی پروا نہیں کہ جب دوسرے ہمیں دہشت گرد کہتے ہیں تو ہمیں بڑا برا لگتا ہے اور جب ہم خود ہی اپنے بھائیوں کو دہشت گرد کہتے ہیں تو پیشانیوں پر ناگواری کے اثرات تک نمایاں نہیں ہوتے؟ اس مقام پر پہنچ کر مجھے کہنے دیجیے کہ مسلمانوں کے دامن میں لگے ہوئے دہشت گردی کے بدنما داغ کی پرورش میں صرف غیروں کا ہاتھ نہیں ہے، بل کہ ہمارے اپنے بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی سن لی جائے کہ مسلمانوں کے صاف وشفاف دامن میں لگا ہوا یہ دھبہ اس وقت تک نہیں مٹ سکتا ہے جب تک کہ ہم خود اس کی پرورش نہ کرنے کی قسم نہ کھالیں۔

ہم جنس پرستی دُنیا کو تباہ و برباد کرنے کی ایک منظّم تحریک

ہم جنس پرستی کی تحریک کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ اس کے داعی ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ دُنیا کا ہر فرد اسے اپنا لے

ابھی حال ہی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ایک اور صوبے واشنگٹن نے بھی ہم جنس پرستی کو قانونی تحفظ عطا کر دیا ہے۔ اس سے پہلے نیویارک، کنکٹی کٹ، آئیوا، میساچوسٹ، نیوہمشائر، ورمونٹ اور واشنگٹن ڈی سی کے بعد یہ آٹھواں صوبہ ہے جس نے ہم جنس شادی کو باقاعدہ قانونی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد ان صوبوں میں جائیداد، مالی معاونت اور عائلی مفادات کے حوالے سے جو مراعات ایک عام شادی شدہ جوڑے کو حاصل ہوتی ہیں، وہ تمام کی تمام ایک ہم جنس شادی شدہ جوڑے کو بھی حاصل ہو جائیں گی۔

دنیا کی معلوم تاریخ کے مطابق ۱۳۶۸ تا ۱۶۴۴ء کے دوران چین پر Ming Dynasty میں ہم جنس شادی کی بعض مثالیں مل جاتی ہیں، جب کہ ایک خاتون دوسری کم سن خاتون کے ساتھ آپس میں ایک ساتھ رہنے کا معاہدہ کر لیتی تھی۔ اسی طرح ایک مرد کا دوسرے مرد کے ساتھ رہنے کی مثال یورپ کے بعض علاقوں میں ملتی ہے۔ دوسرے تاریخ داں کے مطابق **Zhou Dynasty** کے دوران بھی چین میں ہم جنس کے درمیان شادی کی مثالیں ملتی ہیں جن کا عہد ۱۰۴۶ تا ۱۲۵۶ ما قبل مسیح ہے۔ اسی طرح رومن امپائر کے مطالعہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس دور میں بھی ہم جنس پرستی کا رواج کسی نہ کسی طور ضرور رہا ہے۔

موجودہ عہد میں اگر ہم اس حوالے سے دنیا پر نگاہ ڈالیں تو یہ امر واضح نظر آتا ہے کہ ہالینڈ نے ۲۰۰۱ء میں سب سے پہلے دنیا میں ہم جنس پرستوں کی شادی کو قانونی طور پر تسلیم کیا ہے۔ اس کے بعد تیزی کے ساتھ دوسرے ملکوں میں بھی اسے قانونی طور پر تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہالینڈ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کئی دوسرے ملکوں نے بھی اسے قانونی جواز فراہم کر دیا۔ ان ممالک میں ارجنٹائنا، بلجیم، کناڈا، آئی لینڈ، ناروے، پرتگال، اسپین، ساؤتھ افریقہ اور سویڈن شامل ہیں۔ اس طرح صرف دس سال کے عرصے میں دس ملکوں نے اسے زندگی گزارنے کا ایک قانونی طریقہ تسلیم کر لیا۔ ہم جنس پرستی کی حمایت کرنے والے یہ امید کر رہے ہیں کہ ۲۰۱۲ء کے اخیر تک دس مزید ملکوں میں اسے قانونی تحفظ حاصل ہو جائے گا اور جس طرح سے دنیا کے مختلف ملکوں میں یہ تحریک زور پکڑتی جا رہی ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ لوگ یقینی طور پر اپنا مقررہ ہدف حاصل کر لیں گے۔

ایسا نہیں ہے کہ مذہب پسندوں کی طرف سے ایسے اقدامات کی مذمت نہ کی جا رہی ہو، لیکن اس کے باوجود "آزادیٔ انسانیت" کے نام نہاد دعوے دار ہر جگہ کامیاب ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ خود امریکہ میں ری پبلیکن پارٹی جو کہ کسی قدر مذہبی رجحانات کی حامی ہے، اس کی مخالفت میں آواز بلند کرتی رہی ہے۔ بل کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جارج بش جونیئر کے دوسری بار صدارتی انتخاب میں کامیابی کے جہاں دوسرے عوامل رہے ہیں، وہیں ہم جنس پرستوں کی شادی کے خلاف واضح بیانات کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔ جس وقت نیویارک میں ہم جنس پرستوں کے درمیان شادی کو قانونی طور پر تسلیم کیا گیا تھا تو کیتھولک فرقہ سے تعلق رکھنے والے پادریوں نے اسے نہایت ہی افسوس ناک قرار دیا تھا۔ ابھی حال ہی میں اس حوالے سے واشنگٹن میں جو بل ایوان میں پاس ہوا ہے اس میں بھی ایسا نہیں ہے کہ سارے ممبران نے اس کی حمایت کی ہے، بل کہ اطلاع کے مطابق اس کی حمایت میں پچپن جب کہ مخالفت میں پینتالیس ووٹ ڈالے گئے۔

ان انکشافات کے بعد یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے فرسودہ خیالات کی بہت

بڑے پیمانے پر پزیرائی نہیں ہو رہی ہے، لیکن جمہوریت کے طے شدہ ضابطوں کے پیش نظر
اکثریت کی حمایت حاصل ہوتے ہی اسے قانونی شکل بہ ہر حال حاصل ہوتی جارہی ہے۔
اسی تیزی کے ساتھ اگر اس تحریک کو کامیابیاں ملتی رہیں تو یہ دنیا کے لیے تباہ کن نتائج کا
باعث بن جائے گا۔ یہ تو کہیے کہ ابھی ہم جنس پرستی کی مخالفت کرنے والے خیمے میں ایسے
لوگ بھی ہیں جو حقوق انسانی کی آزادی کے حوالے سے بھی صدائے احتجاج بلند کرتے
رہتے ہیں، لیکن وہ وقت کس قدر خوف ناک ہوگا جب ہم جنس پرستی کی حمایت کرنا ''حقوقِ
انسانی'' کے لیے لڑنے کا متبادل بن جائے۔ پھر تو لوگ اپنے آپ کو محض انسانیت دوست
ثابت کرنے کے لیے ہم جنس پرستی کی حمایت کرنے لگیں گے، ٹھیک اسی طرح جب کہ ایک
مسلمان اپنے آپ کو ''ترقی یافتہ'' ثابت کرنے کے لیے مغربی تہذیب کی پزیرائی کرنے
لگتا ہے۔

دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیے کہ کیا ہم جنس پرستی کی تحریک دنیا کو تباہی کی طرف لے جانے
کی ایک منظم کوشش نظر نہیں آتی؟ یہ بات تو اتنی موٹی ہے کہ دور افتادہ علاقے کا ایک عام
انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب ہمیں ایک نہ ایک دن مرجانا ہے اور ہمارے بعد کوئی دوسرا
آئے گا نہیں تو نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا گھر ویران و برباد ہو جائے گا۔ کسی فرد واحد کے لیے یہی
ذاتی گھر بڑے پیمانے پر عوام کے لیے دنیا ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک طرف تو
''پڑھے لکھے'' لوگ تعلیم و ترقی اور دنیا کو مزید پرکشش بنانے کی وکالت کرتے ہیں اور
دوسری طرف ایسے لوگوں کی حمایت بھی کرتے ہیں جو دنیا کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ اسے
فکری تصادم کی شرمناک مثال کہنا حالات کی صحیح ترجمانی ہوگی۔

صاحبو! اگر دہشت پسندی کی مذمت اس بنیاد پر کی جاتی ہے کہ دہشت گردی کے
واقعات سے ہنستی کھیلتی آبادی ویرانے میں تبدیل ہو جاتی ہے تو ہم جنس پرستی سے بھی تو نتیجے
کے طور پر دنیا ایک نہ ایک دن ویران ہو جائے گی۔ ایک ہی وجہ مذمت و استکار اگر دونوں
صورتوں میں موجود ہے تو ایک کی مذمت اور دوسرے کی پزیرائی آخر کس جذبے میں؟ یہ صحیح
ہے کہ دونوں میں فرق ہے، لیکن یہ برائے نام ہی ہے، وہ یہ کہ دہشت گردی کے واقعات

سے دنیا علی الفور ویران ہو جائے گی، جب کہ ہم جنس پرستی سے یہی ویرانی تسلسل کے ساتھ
آہستہ آہستہ ہوگی، لیکن دونوں کا لازمی نتیجہ تو ویرانی ہے۔

اچھا اب ایک دوسرے زاویے سے زیرِ غور موضوع پر نگاہ ڈالیے۔ یہ بات مسلم ہے
کہ دنیا کی ہر تحریک کے داعی یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے سب لوگ ان کی تحریک کو اپنالیں۔ یہ
حال صرف دینی تحریک کے داعیوں تک محدود نہیں، بل کہ سیاسی زعما سے لے کر سماجی،
تجارتی اور تفریحی کلچر سے تعلق رکھنے والوں تک کا حال یہی ہے، لیکن یہ ہم جنس پرستی کی
تحریک کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ اس کے داعی ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ دنیا کا ہر فرد اسے اپنا
لے۔ یہ اس لیے کہ نہ صرف ایسا کرنے سے دنیا ختم ہو جائے گی، بل کہ دنیا کے ساتھ ساتھ
ان کی تحریک بھی مر جائے گی۔ لہٰذا اپنی تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے انھیں بہ ہر حال کچھ
لوگوں سے گزارش کرنی ہوگی کہ وہ ان کے مشن میں شرکت نہ کریں۔ یہاں پہنچ کر ان کے
فکری سرمایہ کا سارا غرور خاک میں ملتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں سے اپنی تحریک میں
شرکت کی اپیل کریں اور دوسروں سے شرکت نہ کرنے کی گزارش۔

اب ذرا ہوش کے ناخن لیں کہ تحریکیں تو اس جذبے میں ظہور پذیر ہوتی ہیں کہ لوگوں
کو فائدہ پہنچے نہ کہ نقصان، تاریکی میں ڈوبی ہوئی زندگی میں اجالا بکھیرا جائے نہ کہ چراغ
زندگی کے لو ہی بجھادی جائے۔

ان حقائق کے آشکار ہو جانے کے بعد یہ ہم سبھوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ جس
طرح ہم دنیا کی خوب صورت، پرکشش اور متوازن شکل درہم برہم کرنے والے دہشت
گردوں کی پرزور مخالفت کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح ہم جنس پرستی کی بھی پوری قوت کے ساتھ
مخالفت کریں کہ یہ تحریک بھی نبضِ ہستی کی تپش سرد کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

اسلام کے خلاف نفرت انگیز جذبات
عالمی امن کے لیے نقصان دہ

اگر دہشت گردی ناقابلِ معافی جرم ہے تو
پھر ایسے اقدامات بھی جرم ٹھہرائے جائیں جن سے دہشت گردی کو تقویت ملتی ہے

بلاشبہ اس وقت عالم اسلام اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہا ہے۔ ۱۱ر ستمبر کے حادثے کے نتیجے میں نیویارک کی جڑواں عمارت کی تباہی و بربادی کے بعد سے عالمی سطح پر اسلام مخالف صدائیں جس طاقت کے ساتھ بلند کی گئی تھیں، اس میں کمی تو بہر حال آئی ہے، لیکن اب بھی گاہے بہ گاہے ان کی بازگشت سنی جارہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض اسلام دشمن عناصر پوری عیاری کے ساتھ اس بات کی درپردہ منصوبہ بند سازشیں کر رہے ہیں کہ اسلام بیزاری کی لہر میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی تو علیٰ رءوس الاشہاد قرآنِ کریم کے نذر آتش کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے، کبھی دہشت گردی کے فرضی الزامات کی آڑ میں کسی بے گناہ کو پسِ زنداں ڈال دیا جاتا ہے، اور کبھی غلط معلومات کی بنیاد پر ایسی فلمیں تیار کی جاتی ہیں جن کے ذریعہ اسلام کے پاکیزہ چہرے کو مسخ کیا جاسکے۔ آپ غور کریں تو ان سارے واقعات کے پس پردہ ایک ہی مشترک مقصد نظر آئے گا اور وہ ہے ''اسلام دشمن لہر'' کی آب یاری۔

چند سالوں پہلے ہالینڈ کے سیاسی لیڈر گیرٹ ولڈرس اور اسکالٹ پمپرنل کی کوششوں سے ''فتنہ'' نامی ایک ڈاکومنٹری بنائی گئی تھی۔ اس کی ابتدا میں سورۂ انفال کی آیت نمبر ۶۰

سنائی گئی ہے:

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ، لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ، اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ، وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔

''اے مسلمانو! تم سے جہاں تک بن پڑے دفاعی قوت کے ساز وسامان اور مقابلے کے لیے بندھے ہوئے گھوڑوں کی کھیپ تیار رکھو تاکہ تم اللہ کے اور اپنے دشمن کو مرعوب کرسکو، نیز دوسرے درپردہ دشمنوں کو بھی تم تو نہیں پہچانتے مگر اللہ اچھی طرح سے پہچانتا ہے، خیال رہے کہ جو کچھ بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کروگے اس کا پورا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ قطعی کوئی ناانصافی نہ کی جائے گی۔'' (فیضان القرآن)

اس کے بعد امریکہ کے جڑواں ٹاور کی تباہی کے دل دہلا دینے والے مناظر دکھائے گئے۔ اسی طرح دنیا میں ہونے والے دہشت گردی کے بعض خوف ناک واقعات کی عکس بندی بھی پردۂ سیمیں پر دکھائی گئی ہے۔ اسلام دشمنی کے جذبے میں اسے ترتیب دینے والوں نے کچھ اس انداز میں اسے پیش کیا ہے کہ دیکھنے والوں پر یہ تاثر پیدا ہوجائے کہ دنیا کے طول وعرض میں ہونے والے سارے دہشت گردی کے واقعات -معاذ اللہ- ''قرآن کریم'' کے فرمودات کا نتیجہ ہیں۔ کہیں کہیں پروڈیوسرز نے بعض آیات کے صرف جزوی حصے ہی کو نقل کیا ہے تاکہ وہ اپنے تعصب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے من چاہے مقاصد حاصل کرسکیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس موقع پر پوری دنیا کے مسلمانوں اور انصاف پسند شہریوں نے پرزور مذمت کی تھی۔ اظہارِ غیض وغضب اس لیے بھی زیادہ تھا کہ اس ڈاکومنٹری کا پروڈیوسر کوئی عام آدمی نہ تھا بل کہ ہالینڈ کی ایک مضبوط سیاسی پارٹی کا لیڈر نکلا۔ اس واقعہ کے بعد یہ بات کسی قدر واضح ہوگئی کہ نہ صرف برصغیر پاک وہند میں ایسے سیاسی عمائدین ہیں جو اسلام کے خلاف کھلم کھلا زہر اگلتے رہتے ہیں، بل کہ اب یہ لہر یورپ و

امریکہ جیسے مذہبی رواداری کے بلند بانگ دعوے کرنے والے ممالک تک جا پہنچی ہے۔

حال ہی میں بننے والی فلم ''دی تھرڈ جہاد'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ خبر بڑے زور وشور کے ساتھ اس وقت میڈیا میں آئی جب کہ نیویارک میں سیکیوریٹی اہل کاروں کی ٹریننگ کے دوران اسے دکھایا گیا۔ امریکہ کے مسلمانوں تک جب یہ دل خراش خبر پہنچی تو مسلم تنظیموں نے پرزور احتجاج کیا اور اسے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو درہم برہم کرنے کی سازش قرار دیا۔ نیویارک کے میئر بلوم برگ نے بھی پولیس کے اس اقدام پر تنقید کی اور کہا کہ اس قسم کی غلطیاں معاشرتی تفریق پیدا کرسکتی ہیں۔ البنی نامی شہر میں ایک تقریب کے دوران انھوں نے کہا کہ نہ ہی میرے علم میں یہ بات ہے اور نہ ہی پولیس کمشنر ریمنڈ کیلی ہی اس سے واقف ہیں کہ اس طرح کی کوئی فلم تربیت کے دوران اہل کاروں کو دکھائی جارہی ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ یہ غلطی سے دوبارہی دکھائی گئی ہے۔ اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے یہ تو وہی بتا سکتے ہیں، لیکن نیویارک ٹائمز کی مصدقہ اطلاعات کے مطابق یہ فلم بہت دنوں سے مسلسل دکھائی جاتی رہی ہے۔

سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے کہ اس فلم کا خاکہ کسی اور نے نہیں بل کہ سیریا سے تعلق رکھنے والے مہاجر باپ کے مسلمان بیٹے ڈاکٹر زہدی یاسر نے پیش کیا ہے۔ اس فلم کی ابتدا میں مکتوب نوٹ کا یہ حصہ پڑھیے:

> ***"The film, which is narrated by devout Muslim American Dr. M. Zuhdi Jasser, opens with the following statement: "This is not a film about Islam. It is about the threat of radical Islam. Only a small percentage of the world's 1.3 billion Muslims are radical. This film is about them."***

''یہ فلم جس کا خاکہ ایک مخلص امریکی مسلمان ڈاکٹر ایم زہدی یاسر نے تیار کیا ہے، اس بیان سے شروع ہوتی کہ یہ فلم اسلام کے بارے میں نہیں ہے، بل

کہ یہ بنیاد پرست اسلام کے ممکنہ خطرات کے حوالے سے ہے۔ ۱.۳ اربلین دنیا کے مسلمانوں میں سے صرف معمولی فی صد مسلمان ہی بنیاد پرست ہیں۔ یہ فلم انہیں کے حوالے سے ہے۔''

اس حقیقت کے طشت از بام ہونے کے بعد کہنے دیجیے کہ

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

فلم کے ناظرین کے مطابق امریکہ میں ممکنہ دہشت گردی کے مفروضہ پرمبنی واقعات کے پس منظر میں دکھایا گیا ہے کہ امریکہ میں داخلی دہشت گردی کے پروان چڑھنے کو خلاف قیاس نہ سمجھا جائے، بل کہ امن عامہ کے ذمہ دار ہوش یار رہیں۔

صاحبو! اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ دہشت گردی اسلام کی بنیادی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ جس طرح ہر شخص کو اس دنیا میں اپنے دفاع کا بنیادی حق حاصل ہے، ٹھیک اسی طرح اسلام نے بھی بلاشبہ اپنے ماننے والوں کو یہ حق دیا ہے کہ وہ دشمنوں سے اپنے دفاع کے لیے تیاری رکھیں۔ یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ دنیا کے سارے ممالک اپنے دفاع کے لیے بڑے بڑے لشکر تیار کریں اور تباہی و بربادی کے نت نئے اسلحہ سے لیس ہوں تو یہ قابل تنقید نہیں، لیکن یہی دفاعی نوعیت کی تیاری مسلمان کرلیں تو یہ ناقابل معافی جرم ہوجائے؟

خیال رہے کہ اس دورنگی فکر کے ساتھ دنیا میں امن کا قیام دیرپا نہیں ہوسکتا۔ دنیا کو خوب صورت اور پرامن بنانے کے لیے سب کو مل جل کر اخلاص کے ساتھ کوشش کرنی ہوگی اور وقار کے ساتھ جینے کا حق مسلمانوں کے لیے بھی تسلیم کرنا ہوگا، اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگر دہشت گردی کے واقعات قابل مذمت اور افسوس ناک ہیں تو ٹھیک اسی طرح دہشت گردی کے جذبات کو ہوا دینے والے دل خراش بیانات، فلمیں اور مضامین بھی قابل مذمت اور جرم کے زمرے میں رکھنے پڑیں گے۔

اِسے بھی دہشت گردی ہی کہتے ہیں

اسباب ومحرکات میں یکسانیت ہو تو ایک کو "دہشت گردی" اور دوسرے کو "معمولی حادثہ"

کہتے ہیں کہ پچھلی دہائی میں ایک اصطلاح جو سب سے زیادہ میڈیا کی پیشانی پر آویزاں رہی وہ ''دہشت گردی'' ہے۔ اسے جہاں اخبارات کی سرخیوں میں سجنے کا موقع میسر آیا، وہیں ٹی وی کے پردے پر رونگٹے کھڑے کر دینے والی تصاویر کی طرف اشارے کرتے ہوئے خبر پڑھنے والے کی زبان پر بھی یہ لفظ رہا۔ اسی کے ساتھ یہ کڑوا سچ بھی سن لیا جائے کہ جتنی اسے شہرت حاصل ہوئی، اسی قدر اس کے محرکات کے حوالے سے کذب بیانیاں بھی کی گئیں۔ دانستہ طور پر ہر ایسے واقعہ کا تانا بانا مسلمانوں سے جوڑنے کی کوشش کی گئی، جسے ''دہشت گردی'' کا نام دیا جاسکتا تھا۔

لیکن مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ ''دہشت گردی'' کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ ہی کوئی خاص علاقہ، نہ اس کا تعلق کسی ایک رنگ ونسل سے ہے اور نہ ہی کسی خاص زبان کے بولنے والوں سے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر کونے میں کسی نہ کسی شکل میں ''دہشت گردی'' کے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں اور یہ بھی پیش نگاہ رہے کہ صرف قتل وغارت گری کے واقعہ ہی کو دہشت گردی کا نام دینا درست نہیں، بل کہ ہر وہ واقعہ جو انسانی آبادی میں خوف وہراس، دہشت وبے یقینی کی کیفیت پیدا کردے، اسے بہ ہر کیف دہشت گردی کے خانے میں ہی رکھنا چاہیے۔

اس پس منظر میں ازراہِ کرم اس رپورٹ پر ایک نظر ڈالیے:

" 31 year-old Samson Jared Storm appeared in justice court. Authorities say he walked through the Slant streat downtown areas of Missoula,

flatening the tires of nearly 50 cars with knives before a surveillance camera led to his arrest.
(Missoulian, Nov 15, 2011)

''۳۱ سالہ سمن جرڈ اسٹورم عدالت میں حاضر ہوئے۔ انتظامیہ کے مطابق اس شخص نے میسولا شہر کے قلب سے گزرتے ہوئے تقریباً پچاس گاڑیوں کے ٹائر چاقو سے پھاڑ دیے، قبل اس کے کہ اسے نگرانی کرنے والے کیمرے کی مدد سے اسے دبوچا جاسکا۔''

اسے بھی پڑھیے:

" Navy sailor Edward Roth 22, accused of breaking out windows on 14 cars and vandalizing an office at Mission velley car dealership causing an estimated $ 75000 worth of damge. " (KFMB-TV8, Nov 28, 2011)

''۲۲ سالہ بحری فوجی ایڈورڈ راتھ پر یہ الزام ہے کہ انھوں نے مشن ویلی کار ڈیلر کے احاطے میں گھس کر وہاں کھڑی ہوئی ۱۴ گاڑیوں کے شیشے توڑ دیے اور بڑے پیمانے پر توڑ پھوڑ کی جس سے تقریباً ۷۵۰۰۰ ڈالر سے زیادہ کا نقصان ہوا۔''

بارِ خاطر نہ ہو تو اسے بھی پڑھ لیجیے تاکہ نتیجۂ گفت گو کی تفہیم قدرے سہل ہو جائے:

" A palm harbar man, Ramsey Charles Shead 21, year old was arrested on Monday after duputies said he vandalized dozens of cars in his neighborhood. "(Bay News 9, 6th June, 2011)

''پالم ہاربر کے ایک ۲۱ سالہ رہائشی کو گرفتار کرلیا گیا ہے، جس کا نام رمسی چارلس شیڈ بتایا جاتا ہے۔ انتظامیہ کی صراحت کے مطابق اس نے اپنے علاقے میں کھڑی ہوئی درجنوں گاڑیوں کو نقصان پہنچایا ہے۔''

یہ تو صرف نمونے کے لیے چند مثالیں ہیں، ورنہ اس طرح کے واقعات ساری دنیا

میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ از راہِ کرم انھیں غور سے پڑھیے۔ مجرم نے اگر ایک دو
گاڑیوں کو نقصان پہنچایا ہوتا تو اسے کسی طرح کی اِنتقامی کارروائی قرار دی جاسکتی تھی یا اسے
نوجوان لڑکوں کے ذریعہ مذاق وتفریح کے خانے میں ڈالا جاسکتا تھا، لیکن اسے کیا کہیے کہ
گاڑیوں کو نقصان پہنچانے والوں نے کسی خاص گاڑی کو نشانہ نہیں بنایا، بل کہ مقصد یہ تھا کہ
سارے علاقے میں خوف وہراس پیدا کر دیا جائے۔ اس طرح بلاشبہ یہ واقعات ''دہشت
گردی'' کے زمرے میں ڈالے جانے کے قابل ہیں۔

دوسری اہم بات یہ کہ باریک بینی کے ساتھ اگر ان واقعات کے محرکات کا جائزہ لیا
جائے تو یہ امر آفتابِ نیم روز کی طرح عیاں ہوجائے گا کہ مجرمین کسی وجہ سے بڑے ہی
غیض وغضب میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے واردات کے وقت یہ جاننے کی کوشش نہ
کی کہ کسی شریف زادے کی گاڑی زد پہ آرہی ہے یا سماج دشمن عناصر کی۔ بعینہٖ یہی وجہِ
واردات ان کی بھی ہوتی ہے جنھیں دنیا ''دہشت گرد'' کہتی ہے۔ واضح رہے کہ میں ان کی
بات نہیں کر رہا ہوں، جن کی جانب خلافِ حقیقت انگشت نمائیاں کی جاتی ہیں، بل کہ مقصود
یہ ہے کہ وہ واقعی مجرم جو دہشت گردی کے افسوس ناک معاملات میں ملوث پائے گئے ہیں۔

صاحبو! یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب دو الگ الگ وارداتوں کے مقاصد ایک،
اسباب ایک اور محرکات بھی ایک ہی، پھر ایک کو ''دہشت گردی'' قرار دیں اور دوسرے کو
''معمولی حادثہ''۔ فکر ونظر کا یہ تضاد آخر کیوں؟ عدل وانصاف کے یہ دو پیمانے کیسے؟ کیا اس
وجہ سے تو نہیں کہ پہلے زمرے میں ڈالے جانے والے واردات کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ
اس کے پسِ پشت عناصر کے لیے ان کی طرف انگشت نمائی کی جاسکتی ہے جنھیں دانستہ طور پر
ذلیل ورسوا کرنا مقصود ہو، جب کہ دوسرے خانے میں ڈالے جانے والے واقعات کچھ اس
طرح واضح ہیں کہ جس کے تانے بانے اپنوں تک ہی پہنچ جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ دہشت
گردی کے خلاف چھیڑی گئی جنگ دنیا اس وقت تک نہیں جیت سکتی جب تک کہ افسوس
ناک واقعات کا عادلانہ تجزیہ نہ کرلے اور پھر اس کے تدارک کے لیے ایسی پالیسی مرتب
کرے کہ جس میں واقعات کی بنیاد پر فیصلے ہوں، نہ کہ پسِ پشت عناصر کی بنیاد پر۔

جرم تو جرم ہے ہی، مگر احساسِ جرم نہ ہونا بھی بہت بڑا جرم

ماضی قریب کے واقعات بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف ہونے والے حادثات پر مجرمین کو احساسِ جرم نہیں ہوتا

دی ہیگ کی عالمی عدالت میں سرب فوج کے سابق چیف آف اسٹاف راڈ کو
ملاوچ کے خلاف مقدمہ زیرِ سماعت ہے۔ یہ وہی بدنامِ زمانہ فوجی جنرل ہے کہ جس کے
ماتھے پر دوسری عالمی جنگ کے بعد یورپ میں سب سے بڑے پیمانے پر قتل وخون کا داغ
ہے۔ ۱۹۹۵ء میں سربرنزا کے علاقے میں سات ہزار مسلمان لڑکے اور مردوں کا قتل اسی کی
سرپرستی میں ہوا۔ اسی نے سراجیوو کا چودہ ماہ تک محاصرہ جاری رکھا جس کے نتیجے میں دس
ہزار سے زیادہ بے گناہ ہلاک ہوئے۔ یہ تو صرف ہلاکتوں کا ایک ممکنہ تخمینہ ہے، لیکن اس
ظالمانہ محاصرہ کی وجہ سے لوگوں نے کس قدر اذیتیں برداشت کیں، کتنے شیر خوار بلک بلک
کر زندگی کی بازی ہار گئے اور کتنے مریض دواؤں کی عدم دست یابی کے نتیجے میں راہیِ ملکِ
عدم ہوگئے، یہ ہول ناک داستانیں تو پردۂ خیال وفکر کی محدود پہنائیوں میں کسی طور سما ہی نہیں
سکتیں۔ اسے قہر وظلم، بربریت وسفاکی اور تشدد وزیادتی کی انتہا ہی کہیں گے کہ ہم نہیں بل
کہ اس کے اپنے بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ یہ شخص **Butcher of Bosnia** ہے۔

بیرونی مداخلت کے بعد جنگ ختم ہوئی اور ۲۰۰۱ء میں جب ملک کا صدر سلووڈن
ملاسووچ گرفتار کرلیا گیا تو راڈ کو ملاوچ فرار ہونے میں کام یاب ہوگیا۔ واشنگٹن کی طرف
سے اس کی گرفتاری پر مدد کرنے والے کو پانچ ملین ڈالر انعام دینے کا اعلان کیا گیا، لیکن
سب کچھ بے سود ثابت ہوا۔ حیرت ہوتی ہے کہ تقریباً سولہ سالوں تک یہ دنیا کی آنکھوں میں

ڈھول جھونکتا رہا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔

دل چسپ بات یہ کہ اس کی بیوی نے اس دوران ایک موقع پر عدالت میں درخواست دائر کردی کہ عرصہ دراز سے چوں کہ اس کے حوالے سے کوئی خبر نہیں ہے، لہٰذا اسے مردہ سمجھ لیا جائے اور اس کی جائداد کا اسے مالک قرار دیا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ عدالت نے اس کی عرضی خارج کردی۔ ۲۶ رمئی ۲۰۱۱ء کو اسے بالآخر گرفتار کیا گیا اور دی ہیگ کی عالمی عدالت کے سپرد کردیا گیا۔

گذشتہ دنوں معمول کی کارروائی کے لیے اسے عدالت میں لے جایا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ ہلاک شدگان کے لواحقین باہر موجود تھے۔ ملاوچ کو دیکھتے ہی ان کے جذبات قابو میں نہ رہ سکے اور بے ساختہ چیخ چیخ کر اسے ہدفِ ملامت بناتے رہے۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ میڈیا نے نوٹ کی کہ جب ملاوچ نے نظر گھما کر ایک خاتون کی طرف دیکھا جس کا بیٹا بھی اس کی ہلاکت خیزیوں کا شکار ہوا تھا تو اس نے اپنی گردن پر اس انداز سے ہاتھ پھیرا کہ جیسے موقع مل جائے تو اس کی گردن بھی اتار دے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنے سے ایک انصاف پسند کو کوئی نہیں روک سکتا کہ اسے اپنے سفاکانہ قتل وغارت گری پر چنداں افسوس نہ تھا۔

اسی طرح ماضی قریب کی ایک دوسری مثال انڈریس بہیرنگ کی ہے کہ جس نے جولائی ۲۰۱۱ء میں ناروے کے دو مقامات پر دن کے اجالے میں برسرِ عام قتل وخون کا ننگا ناچ کھیل کر دنیا کو ششدر کردیا۔ بہیرنگ نے **Oslo** کی سرکاری عمارت کے سامنے ایک کار میں بم نصب کیا جس کے پھٹنے سے گیارہ لوگوں کی موت واقع ہوئی۔ پھر یہاں سے وہ سیدھے **Utoya** پہنچا جہاں برسرِ اقتدار لیبر پارٹی کے نوجوانوں کی تقریب ہو رہی تھی۔ نوجوان روایتی طرز کے عیش وطرب میں مست تھے کہ اس نے گھات لگا کر اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ ان دونوں واقعات میں تقریباً ۹۲ر افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ بہیرنگ کو گرفتار کرلیا گیا اور اس پر مقدمہ کی سماعت شروع ہوگئی۔

گذشتہ ہفتے اسے بھی عدالت میں پیش کیا گیا تھا تو اس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ قتل

وخون کرنے کا اعتراف تو کیا لیکن اسے ''جرم'' تسلیم کرنے سے انکار کر بیٹھا۔ اس کے خیال میں جو کچھ بھی اس نے کیا ہے وہ ملکی مفاد میں کیا ہے۔ اس کے بہ قول وہ یورپ کے پروانۂ ہجرت عطا کرنے کی پالیسی کے سخت خلاف ہے کہ جس کے نتیجے میں دنیا کے مسلمان یورپ منتقل ہوتے ہیں اور یورپ کی آزادانہ تہذیب وتمدن پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

اس واقعہ کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ بہیرنگ کے اعترافِ قتل کے باوجود وکلا اسے نفسیاتی مریض ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مضحکہ خیزی تو یہاں تک ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے کہہ رہا ہے کہ اس نے لوگوں کو پورے ہوش وحواس کے ساتھ ہلاک کیا ہے اور وہ مریض نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود کوشش ہو رہی ہے کہ کسی طرح اسے مریض ثابت کیا جاسکے تاکہ اپنے وطن کے ''لاڈلے'' پر ''دہشت گردی'' کا الزام عائد نہ ہو۔

بہ ہر کیف مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ بہیرنگ کو اپنے کیے پر نہ کوئی افسوس ہے اور نہ ہی کوئی پچھتاوا، بل کہ وہ کھلے بندوں اپنی واردات پر فخر کر رہا ہے۔ سنا تو یہ تھا کہ بڑے سے بڑے سفاک مجرمین کو بھی کبھی کبھی ماضی میں کیے ہوئے جرائم پر افسوس ہو جاتا ہے، لیکن یہ دونوں اس قسم کے مجرمین ہیں کہ جنھیں اپنے کیے پر کوئی افسوس نہیں۔

مندرجہ بالا دونوں حادثات پر نگاہ ڈالیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں کئی چیزیں قدرِ مشترک ہیں۔ یہ دونوں حادثات یورپ میں ہوئے ہیں اور دونوں واقعات کے پس پردہ اسلام دشمنی کے نفرت انگیز جذبات ہی کی کارفرمائی ہے۔

مجھے یاد آیا کہ جن دنوں راڈکو ملاسووچ کے ہاتھوں میں فوج کی کمان تھی اس وقت سربیا کے صدر سلوبوڈن ملاسووچ تھے۔ ان دنوں مسلمانوں کی ہلاکت وبربادی کو روکنے کے بہ جائے انھوں نے فخریہ انداز میں کہا تھا کہ

"I am saving the world from the Islamic threat." *(Minaret, June 1997)*

ترجمہ: مَیں دنیا کو اسلامی خطرات سے بچا رہا ہوں۔

صاحبو! آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے قتل وخون پر تفاخر دنیا کے کس خطے میں

ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے؟ یہ وہ خطہ ہے جو تعلیمی اعتبار سے بڑا ہی ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے اور جسے صنعت وحرفت کے میدان میں امامت کا منصب حاصل ہے، نیز جو مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی پر فخر ومباہات کا اظہار کر رہے ہیں وہ کوئی ''قدامت پسند'' نہیں بل کہ تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ اب یہی دیکھیں کہ راڈ کو ملاسووچ ملٹری اسکول سے فارغ التحصیل ہے اور جس کی ذہانت وفطانت کا یہ عالم ہے کہ اس نے فائنل امتحان کے ممکنہ گریڈ دس میں سے ۹.۵۷ نمبر حاصل کیے۔

اسی طرح سلووڈن ملاسووچ بھی **University of Belgrade's Law School** سے فارغ التحصیل تھا، نیز انڈریس بھیرنگ بھی اوسلو اسکول سے فارغ التحصیل ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہلاکت و بربادی پر ایک مہذب معاشرے میں تعلیم یافتہ لوگ تفاخر کر رہے ہیں۔

اس انکشاف کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ظلم وتشدد کے پس منظر میں ''مہذب وغیر مہذب'' اور ''تعلیم یافتہ وغیر تعلیم یافتہ'' کے درمیان دنیا میں کوئی خطِ فاصل کھینچنا عبث ہے۔ جہاں غیر متمدن اور غیر تعلیم یافتہ قومیں مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہیں وہیں مہذب اور تعلیم یافتہ گروہ بھی مسلمانوں کے خلاف گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ جب واردات اسلام دشمنی کی بنیاد پر ہوں تو مجرمین کو احساسِ جرم نہیں ہوتا؟ مجھے تو صدفی صد یہی توجیہ دل کو لگتی ہے، ورنہ عموماً ہوتا یہ ہے کہ مجرمین اپنے دفاع کے لیے عدالت میں اِقدامِ جرم سے ہی انکار کر بیٹھتے ہیں تا کہ وہ کسی طور سزا سے بچ سکیں، لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے کہ وہ کھلے بندوں اعتراف کر رہے اور بڑے فخر کے ساتھ۔ اور آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ افسوس ناک پہلو مجھے ترقی یافتہ دنیا کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ لگتا ہے کہ کسی کے ساتھ زیادتی کرنے کے بعد مجرم کو احساس جرم تک نہ ہو۔

امریکی اِنتخابات میں مذہبی جذبات سے اِستفادہ

دنیا میں ہونے والے، اردوات کو سیاسی عدمِ اِستحکام، گروہی عصبیت اور لاقانونیت کی وجہ سے ہونے والے حادثات کے خانے میں رکھیں

ساٹھ کی دہائی میں، باراک ابامہ سینئر کینیا سے **Huwaii University** میں اعلیٰ تعلیم کے لیے آئے۔ یہاں ان کی ملاقات **Stanley Ann Dunbam** سے ہوئی جو کہ ایک عیسائی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہی ملاقات دھیرے دھیرے گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی اور بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی کہ دونوں نے ۲؍فروری ۱۹۶۱ء میں شادی کرلی۔ ۴؍اگست ۱۹۶۱ء کو ان کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے باراک حسین ابامہ رکھا۔

کہتے ہیں کہ باراک ابامہ سینئر کو ہارورڈ یونی ورسٹی میں اسکالرشپ مل گئی۔ ان کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا، اس لیے وہ کیلیفورنیا منتقل ہو گئے اور ۱۹۶۴ء میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ باراک ابامہ سینئر بعد میں کینیا واپس ہو گئے اور وہیں کے ہو رہے یہاں تک کہ ۱۹۸۲ء کے ایک سڑک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس درمیان وہ صرف ۱۹۷۱ء میں ایک بار اپنے بیٹے سے ملاقات کے لیے ہوائی آئے۔

باراک ابامہ سینئر سے طلاق کے بعد اسٹینلے این ڈنھم نے ۱۹۶۵ء میں **Lolo Soetoro** سے شادی کرلی جو کہ انڈونیشیا سے حصولِ تعلیم کے لیے ہوائی آئے ہوئے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں جب سوہارتو نے انڈونیشیا میں زمامِ اِقتدار سنبھالا تو اپنے وطن سے بیرونِ ملک جا کر علم حاصل کرنے والے سارے طلبہ واپس بلا لیے گئے۔ لہٰذا یہ خاندان

باراک ابامہ کے ساتھ انڈونیشیا منتقل ہوگیا۔ تاریخ نویس کہتے ہیں کہ یہیں پر باراک ابامہ نے اپنی عمر کے ابتدائی ایام گزارے اور مقامی اسکول میں تین سال تک تعلیم بھی حاصل کی۔

باراک ابامہ نے اپنے سوتیلے باپ کے مذہب کے حوالے سے جو انکشاف کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک آزاد خیال مسلمان تھے۔ ۱۹۷۱ء میں باراک ابامہ واپس اپنے نانا کے گھر ہوائی آگئے اور اپنی پوری تعلیم یہیں حاصل کی۔

اس مختصر سی تمہید سے صرف مقصود یہ ہے کہ ہم امریکہ کے موجودہ صدر باراک حسین ابامہ کی ابتدائی زندگی کے ذیل میں یہ اچھی طرح دیکھ لیں کہ ایک مسلمان سے ان کا رشتہ کس حد تک ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ان کی رگوں میں ایک مسلمان کے خون کی آمیزش بھی ہے، لیکن اس سے یہ قطعی ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مسلمان بھی ہیں۔

اسے اتفاق کہیے کہ ان کے سوتیلے باپ بھی انڈونیشیا کے ایک آزاد خیال مسلمان تھے، جنھیں اس بات سے کوئی دل چسپی نہ تھی کہ ان کا سوتیلا بیٹا کس مذہب کے راستے پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انڈونیشیا میں باراک ابامہ کی ابتدائی تعلیم کے لیے غالباً عیسائیوں کی نگرانی میں چلنے والے اسکول کا انتخاب کیا گیا۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ جب وہ دس سال کے رہے ہوں گے تو اپنے نانیہال واپس آگئے، جہاں انھوں نے ایک مسیحی کی طرح زندگی گزاری۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک مسلمان کے ساتھ بس اسی قدر تعلقات کو ان کے سیاسی مخالفین بار بار اس طرح سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ان کے مذہبی عقیدے کے حوالے سے امریکہ کی اکثریت مشکوک ہوجائے۔ ۲۰۰۸ء میں جب ابامہ نے اپنا پہلا الیکشن لڑا تھا اس وقت بھی سیاسی بازی گروں نے اس موضوع کو اٹھایا تھا اور ابامہ کو بڑے ہی صاف لفظوں میں یہ کہنا پڑا تھا کہ وہ ایک مسیحی ہیں۔ اب جب کہ امریکہ میں صدارتی انتخاب کی گہما گہمی شروع ہوچکی ہے، ایک بار پھر اس موضوع کو زندہ کیا جارہا ہے۔ ابھی حال ہی میں فرانک لین گراہم نے MSNBC نامی ایک ٹی وی شو میں کہا ہے:

"Islam sees him as a son of Islam ... I can't say categorically that (the president is not Muslim)

because Islam has gotten a free pass under Obama."

''اسلام تو انھیں اسلام کے ایک سپوت کی نگاہ سے دیکھتا ہے .... میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا (کہ وہ مسلمان نہیں ہیں) کیوں کہ ابامہ کے دور حکومت میں اسلام کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔''

فرانکلن گراہم نے اپنے اس مزعومہ خیال کے لیے جو بنیادیں پیش کی ہیں، وہ نہایت ہی مضحکہ خیز ہیں۔ یہ باتیں ایسی سطحی قسم کی ہیں کہ دنیا کے موجودہ حالات پر گہری نظر رکھنے والا تو درکنار، ایک عام سا انسان بھی شاید کہنے کی ہمت نہ جٹا سکے۔ لگے ہاتھوں ذرا آپ بھی ان کے ''مستحکم دلائل و براہین'' کی بنیادیں ملاحظہ فرمالیں جو ''سطحِ آب'' پر ایستادہ ہیں۔ آپ کہتے ہیں:

"All I know is under Obama, President Obama, the Muslims of the world, he seems to be more concerned about them than the Christians that are being murdered in the Muslim countries," Graham said.

''میں تو بس یہی دیکھ رہا ہوں کہ ابامہ، صدر ابامہ مسلم ممالک میں مسیحی برادری کے قتل وخون سے کہیں زیادہ دنیا کے مسلمانوں کے حوالے سے فکر مند نظر آتے ہیں۔''

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ بیان ایک ترقی یافتہ ملک کے ایک باوقار سیاسی رہ نما دے رہے ہیں۔ اس طرح کی باتیں اگر تیسری دنیا کے کسی پس ماندہ ملک کے ایک عام شہری نے دیا ہوتا تو ممکن تھا کہ ہم اسے اس کی لاعلمی پر محمول کرتے ہوئے پس پشت ڈال دیتے، لیکن اسے ہم کس خانے میں ڈالیں؟ کل تک تو ہم نے صرف سن رکھا تھا کہ سیاسی عمائدین کذب بیانی کرتے ہیں، لیکن آج یقین کرنا مشکل ہے کہ آیا اس قسم کی بھی بے بنیاد کذب بیانی ہو سکتی ہے کہ جس کا نہ کوئی سر ہو اور نہ پیر؟

فرانکلن گراہم کے اس متنازعہ بیان پر مسلم کمیونٹی کے ذمہ داروں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے خلاف حقیقت قرار دیا۔ شارلوٹ مسلم کمیونٹی کے ناظم نشر واشاعت جناب جبرئیل ہوگ نے اس کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں صرف ڈرون حملے کے نتیجے میں مرنے والوں کی تعداد شمار کرلی جائے تو عالم اسلام میں قتل کیے جانے والے مسیحیوں کی اجتماعی تعداد سے کئی گنا زیادہ ہوجائے۔ بلاشک وشبہ یہ بات حرف بہ حرف درست ہے۔

صاحبو! ہمیں اعتراف ہے کہ بعض مسلم افریقی ممالک میں کبھی کبھی مذہب کی بنیاد پر مسلمان اور مسیحیوں کے مابین اختلافات شدت اختیار کرجاتے ہیں اور بات قتل وخون تک پہنچ جاتی ہے، لیکن یہ بھی تو نگاہ میں رکھیں کہ سیاسی طور پر ان غیر مستحکم افریقی ملکوں میں صرف مسیحیوں کا ہی قتل نہیں ہوتا، بل کہ بسااوقات قبائلی عصبیت کے نشے میں جب لوگ آپس میں دست باگریباں ہوتے ہیں تو بڑی تعداد میں مسلمان بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

لہٰذا عدل وانصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ افریقی ممالک میں ہونے والے مسیحیوں کے قتل کو اس طرح نہ دیکھا جائے کہ انھیں ہی خصوصیت کے ساتھ نشانہ بنایا جارہا ہے، بل کہ بہتر ہے کہ ہم اس قسم کی واردات کو سیاسی عدم استحکام، گروہی عصبیت اور لاقانونیت کی وجہ سے ہونے والے حادثات کے خانے میں رکھیں جو بلا امتیازِ مذہب وملت دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوسکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ ہماری اس توجیہ کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ ہم اس قسم کے افسوس ناک واقعات کو جائز ٹھہرا رہے ہیں، بل کہ مدعا صرف اس قدر ہے کہ قانون کی سرپرستی میں ہونے والے قتل وخون اور لاقانونیت کی وجہ سے گروہی تصادم کے نتیجے میں ہونے والے قتل وخون میں بہ ہر حال فرق ہے۔

وہ قتل بھی کرتے ہیں تو رُسوا نہیں ہوتے

مسلمانوں کی آہیں بھی انھیں دہشت گرد بنا دیتی ہیں
اور وہ قتل وخون کی ہولی کھلیں جب بھی پارسا ٹھہریں

جولائی ۲۰۱۱ء کی بات ہے کہ انڈریس بہیرنگ نامی ایک نوجوان نے یورپ کے ملک ناروے میں اپنے جنونی اقدام سے سبھوں کو خوف زدہ کردیا تھا۔ پریس کے نمائندوں کی رپورٹ کے مطابق سب سے پہلے اس نے **Oslo** کی سرکاری عمارت کے سامنے ایک کار میں بم نصب کیا جس کے پھٹنے سے گیارہ لوگوں کی موت واقع ہوئی۔ یہاں سے وہ **Utoya** پہنچا جہاں برسر اقتدار لیبر پارٹی کے نوجوانوں کی ایک تقریب ہو رہی تھی۔ نوجوان روایتی طرز کے عیش وطرب میں مست تھے کہ اس نے گھات لگا کر اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ ان دونوں واقعات میں تقریباً بانوے شہری لقمہ اجل بن گئے۔ پورا یورپ اس واقعہ کے پس منظر میں سکتے میں آگیا اور خوف ودہشت کے مارے لوگوں کی نیندیں اُڑ گئیں۔ حیرت دوچند اس لیے بھی تھی کہ ناروے عموماً یورپ کا پرسکون ملک سمجھا جاتا ہے، جو عالمی سطح پر ہونے والی سیاسی قلابازیوں سے بہت حد تک دور بھی رہتا ہے۔ ان حالات میں اتنا بڑا واقعہ ہوجانا واقعی بڑا ہی افسوس ناک اور حیرت انگیز تھا۔ ساری دنیا نے اس واقعہ کی مذمت کی اور اسے بہت بڑا انسانی سانحہ قرار دیا۔

مصدقہ اطلاعات کے مطابق فائرنگ کرنے والے مجرم کو گرفتار کرلیا گیا اور معمول کی کارروائی کے مطابق اس واقعہ کی مزید تحقیقات شروع ہوگئیں۔ عام طور پر قتل و غارت گری کرنے والے مجرم کمرۂ عدالت میں خود کو بچانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا

کرتے ہیں، لیکن حیرت تھی کہ انڈریس نے اپنے کیے ہوئے افسوس ناک اقدام کا اقرار کرلیا۔ حکومتی تفتیشی ادارے نے جب اس واقعہ کے محرکات سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی تو اسے خود انڈریس کے ذریعہ کی ہوئی ایک ریکارڈنگ ملی جسے اس نے واردات سے پہلے بنایا تھا۔ اس ریکارڈنگ کے مطابق اس نے اپنے ہونے والے اقدام کو مسلمانوں کے خلاف ''صلیبی جنگ'' کے آغاز سے تعبیر کیا تھا اور اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ وہ یورپ کی سیاسی پالیسی سے سخت نالاں ہے، جس کی وجہ سے ہجرت کرنے والے باہر کے لوگوں نے ملک کی روایتی تہذیب وتمدن کو خاصا متاثر کردیا ہے۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ ہوا۔ اب آیئے پچھلے ہفتے ہونے والی ایک کانفرنس میں انڈریس کا علاج کرنے والے دو نفسیاتی ڈاکٹروں **Mr. Synne Serheim** اور **Mr.Torgeir Husby** کا بیان سنتے ہیں۔

موصوف فرماتے ہیں انھوں نے باریک بینی کے ساتھ انڈریس کا طبی جانچ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسے واردات کے دنوں میں سائکاسس (**Psychosis**) نام کی شکایت ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے انسان کے فیصلے کرنے کی صلاحیت بری طرح متاثر ہو جاتی ہے اور مریض اپنے اقدامات کے حوالے سے صحیح فیصلے کرنے کی قدرت کھودیتا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مجرم کو رسوائی سے بچانے کی کیسی کیسی تدبیریں کی جارہی ہیں؟ تفتیش کرنے والوں نے ایک نہیں کئی ایک قرائن وشواہد کو دانستہ طور پر نظر انداز کیا ہے؟ آگے بڑھنے سے قبل ذرا ان شواہد پر ایک نگاہ ڈالتے چلیے:

۱- واردات سے قبل انٹرنیٹ پر خود اس کا ذاتی بیان کہ وہ مسلمانوں کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔

۲- اس حوالے سے ویڈیو ریکارڈنگ۔

۳- کار میں گولہ بارود کی تنصیب۔

۴- کار کو کسی ایسی جگہ لے جا کر پارک کرنا جہاں زیادہ سے زیادہ نقصان ہوسکے۔

۵- اوٹویا میں برسر اقتدار لیبر پارٹی کے زیر اہتمام والی تقریب کا علم۔

۶- وقت مقررہ پر اوٹویا پہنچ کر گولیوں کی بوچھاڑ کرنا۔

۷- حکومت کے خلاف اپنے غم وغصہ کے اظہار کے لیے ایسی تقریب کو نشانہ بنانا جو انہیں کے زیر اہتمام منعقد ہورہی ہو۔

۸- پورے منصوبے کو پوری طرح پوشیدہ رکھنا۔

ملاحظہ فرمایئے کہ واردات سے قبل کس قدر منظم منصوبہ بندی کی جارہی ہے۔ ایک عیار وہوشیار مجرم کی طرح انڈریس نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ اپنے انسانیت سوز اقدام کو زیادہ سے زیادہ حد تک کامیابی سے ہم کنار کرسکے۔ تفتیش کرنے والوں کی عقل وفراست پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ انھوں نے مندرجہ بالا سارے قرائن وشواہد کو یکسر نظر انداز کرکے یہ ثابت کردیا کہ انڈریس نے جو کچھ کیا وہ دانستہ جرم نہیں تھا، بل کہ وہ اس وقت اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ اسے کہتے ہیں ''عقل مند بے وقوف''، یعنی اس نے بے وقوفی بھی کی ہے، مگر عقل مندی کے ساتھ۔ میں نے سنا تو تھا کہ ایک دوسرے کی ضد کبھی بھی جمع نہیں ہوسکتیں، لیکن ایسا لگتا ہے کہ نئے عہد میں اب یہ فلسفہ بھی بدل رہا ہے۔ اسے رسوائی سے بچانے کی کیسی کیسی ترکیبیں کی جارہی ہیں؟

ہوسکے تو دنیا کے منظر نامے پر گزشتہ دس سالوں میں ہونے والے افسوس ناک واقعات پر ایک سرسری نگاہ ڈالیے اور یہ دیکھیے کہ جب بھی کسی واقعہ کے پس پشت کسی مسلمان کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے تو ہمیشہ اسے دہشت گردی ہی کے خانے میں ڈالا گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ واقعی اس قسم کے سارے واردات مسلمانوں ہی نے کیے ہیں، بل کہ مدعا صرف اس قدر ہے کہ ان افسوس ناک واقعات کے پیچھے جب بھی کسی مسلمان کا نام لیا جانا ممکن ہوا، اسے اس انداز میں ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ ساری حرکتیں مسلمانوں کے مذہبی جنون کا شاخسانہ ہیں۔ یعنی ''الزام'' کے ساتھ ساتھ پوری کوشش کی گئی کہ ملزم کا ''ایمان و عقیدہ'' بھی برسر عام رسوا ہو، اس کی ''تہذیب وتمدن'' کا جنازہ بھی نکل جائے اور اس کے کروڑوں ہم مذہب کا سر بھی جھک جائے۔ لیکن اسی قسم کے افسوس ناک واقعات کے پس

پشت ''بہ حالت مجبوری'' اگر کسی غیر مسلم کا نام لیا جا رہا ہو تو اکثر اسے (Insane) پاگل قرار دے دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی اس کے اقدام کو ''ذاتی نوعیت'' کا عام سا واقعہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ ملزم کے ساتھ ساتھ نہ تو اس کا مذہب رسوا ہو اور نہ ہی اس کے ہم مذہب۔

صاحبو! فکر و نظر کی یہ دو رنگی اگر زمانہ جاہلیت میں ہوتی تو کسی طرح صبر کیا جا سکتا تھا کہ علم و آگہی کے فقدان کی وجہ سے اس قسم کے متعصبانہ نظریات عام طور پر قوموں میں پنپتے رہتے ہیں، لیکن اسے کیا کہیے کہ وہی قدیم نظریہ تعصب اس ترقی یافتہ دور میں بھی باقی ہے۔ بس فرق اس قدر ہے کہ پہلے بے حیائی و ہٹ دھرمی کے ساتھ لوگ کہہ دیا کرتے تھے کہ ہم ہر قیمت پر اپنوں کی حمایت کریں گے، اور اب ''علم نفسیات'' کا سہارا لے کر اپنوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی، موانست و غم خواری اور حمایت و نصرت کے جذبات رکھے جا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں نہ پہلے عدل و انصاف کی بنیاد پر فیصلے کیے جاتے تھے اور نہ اب کیے جا رہے ہیں۔ طریقہ کار گو کہ بدل گیا ہو لیکن نتیجے کے اعتبار سے ہم اب بھی اسی تہذیب و تمدن کی فضا میں سانس لے رہے ہیں جب کہا جاتا تھا کہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس''۔

امریکی فوجی نصاب میں اِسلام مخالف مواد کی شمولیت

انکوائری کے بعد خطاکاروں کو سخت سزا دی جائے
تاکہ کوئی اس قسم کی حرکت دوبارہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے

گزشتہ دنوں امریکی فوجی جنرل مارٹن ڈیمپسے کے انکشاف نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں انفرادی طور پر چند لوگوں کا کسی مذہب کے خلاف نفرت انگیز خیالات کا اظہار کرنا حیران کن نہیں، لیکن ایک ملک کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی فوج کے ذہن و فکر میں اسلام کے خلاف نفرت انگیز جذبات بٹھانے کی کوششیں کرنا نہایت ہی افسوس ناک ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ **Army Lt. Col. Matthew A. Dooley** کو اگست ۲۰۱۰ء سے فوجیوں کی تربیتی کلاس لینے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ انھوں نے جولائی ۲۰۱۱ء میں اٹھائیس صفحات پر مشتمل جنگی حکمت عملی کے تناظر میں ایک ماڈل ترتیب دیا جسے **"So What Can We Do"** کے نام سے معنون کیا۔ ڈولے اپنا متنازعہ ماڈل پیش کرنے سے پہلے تمہید باندھتے ہوئے لکھتا ہے کہ

> **" This model asserts Islam has already declared war on the west, and the United States specifically, as is demonstrable with over 30 years of violent history. It is therefore, illogical to continue along our current global strategy models that presume there are always possible opptions for common ground and detent with**

Muslim Umma without waging."

near "total war". (Page:7)

ترجمہ: گذشتہ تیس سالہ پرتشدد واقعات کے پس منظر میں یہ ماڈل اعتراف کرتا ہے کہ اسلام نے پہلے ہی مغرب اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی ہے۔لہٰذا موجودہ عالمی حکمت عملی ماڈل کو مزید اپنائے رکھنا غیر منطقی ہے کہ جس کے مطابق ''مکمل جنگ'' چھیڑے بغیر بھی ملت اسلامیہ کے ساتھ تعلقات اُستوار کرنے کے لیے ممکنہ مشترکہ بنیادیں موجود ہیں۔

ملاحظہ کیجیے کہ کس طرح ہوا کے دوش پر ایک متعصبانہ فکر کی پرورش کی گئی اور پھر اسی ''خلافِ واقعہ حقیقت'' کی بنیاد پر قتل وخون کو ہوا دینے والی حکمت عملی بھی بنائی جارہی ہے! دنیا کا ہر انصاف پسند شہری اس بات کی گواہی دے گا کہ اسلام نے کبھی بھی کسی قوم کے خلاف ظلم وزیادتی کی اجازت نہیں دی ہے۔یہ وہ حقیقت ہے جو تاریخ کے صفحات پر آفتابِ نیم روز کی طرح روشن وتابناک ہے۔بس شرط یہ ہے کہ اسے تعصب کی عینک اتار کر صرف تلاشِ حق کے جذبے میں پڑھا جائے۔

اس تمہید کے بعد ڈولے نے اپنا جارحانہ ماڈل پیش کرتے ہوئے جو تجویز دی ہے، اسے لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے اور آنکھوں کا دامن تر بہ تر ہے۔قارئین کے ذوقِ سلیم سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ کسی طرح دل پر جبر کر کے یہ حصہ پڑھ لیجیے!

" This would leave open the option once again of taking war to a civilian population wherever necessary (the historical precedents of Dresden, Tokyo, Hiroshima, Nagasaki being applicable to the Mecca and Medina destruction DP in phaseIII). " (Page: 8)

ترجمہ: یہ صورت حال ایک بار پھر بہ وقتِ ضرورت انسانی آبادیوں تک جنگ کا دائرہ وسیع کرنے کا دروازہ کھول رہی ہے (جس طرح کے تاریخی حادثات

ڈریسڈین، ٹوکیو، ہیروشیما، ناگاساکی میں ہوئے تھے، مکہ اور مدینہ کی تباہی کے لیے اسی پر عمل کیا جانا چاہیے)۔

یعنی جس طرح عالمی جنگ کے موقع پر جاپان کے دو مشہور ومعروف شہر ہیروشیما اور ناگاساکی کو ایٹم بموں کے ذریعہ تباہ وبرباد کردیا گیا تھا ٹھیک اسی طرح ضرورت پڑنے پر مسلمانوں کے دینی مراکزِ عقیدت کو بھی تباہ کردیا جانا چاہیے-معاذ اللہ ثم معاذ اللہ- اسے دہشت پسندانہ نظریہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ اِسلام کے سرمایۂ افتخار وعزت کی بے حرمتی کے لیے جارحانہ حکمت عملی ترتیب دینا تو سب سے بڑی دہشت گردی ہے۔دیکھنے والے دیکھ لیں کہ کہنے کو تو یہ شخص پڑھا لکھا کہلاتا ہے، لیکن دل میں اسلام کے خلاف کس قدر نفرت و کدورت بھرا ہوا ہے؟

اپنے اس مزعومہ ماڈل کے اختتام پر بڑے ہی فیصلہ کن انداز میں کہتا ہے کہ

"It is therefore time for the United States to make our true intention clear. The barbaric ideology will no longer be tolerated. Islam must change or we will facilitate its self-destruction."

(Page:28)

ترجمہ: لہٰذا وقت آگیا ہے کہ امریکہ ہمارا اصلی عزم واضح کردے۔ظالمانہ طرزِ فکر اب برداشت نہیں کی جائے گی۔یا تو اسلام خود کو تبدیل کرلے یا پھر ہم ایسے اقدام کریں گے کہ وہ خود ہی تباہ وبرباد ہوجائے۔

مسٹر ڈولے! یہ وہ خواب ہے جو صبح قیامت تک پورا نہیں ہوسکتا کہ یہی وہ دین ہے جو آخری ہے اور اسے بہ ہر حال منتہائے کمال تک پہنچنا ہے۔تاریخ بتاتی ہے کہ ماضی میں بڑے بڑے طاقت ور بادشاہوں نے عالم اسلام کو تباہ وبرباد کرنے کی کوششیں کیں، لیکن ہر بار اِسلام ایک نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ بیدار ہوا۔بغداد میں اسلامی تہذیب وتمدن کی تاراجی سے کون واقف نہیں؟ اسپین میں علمی دانش کدے کی بربادی سے بھی دنیا لاعلم نہیں۔ اس لیے کان کھول کر سن لیا جائے کہ ہمیں اسلام کے تحفظ وبقا کے حوالے سے کوئی تشویش

نہیں، لیکن افسوس اس بات پر کہ ایک نام نہاد تعلیم یافتہ لیکچرار نے کس بے دردی کے ساتھ عدل و انصاف کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ڈولے کے جارحانہ نظریات صرف ایک سال کے اندر ہی گرفت میں آ گئے، ورنہ کیا معلوم اس متعصبانہ فکر و نظر کی گود میں کتنے فوجی پروان چڑھ جاتے؟ واضح رہے کہ چیئرمین چیف آف اسٹاف جنرل ڈیمپسے تک جوں ہی یہ اطلاع پہنچی، انھوں نے اسے نصاب سے ہٹوا دیا اور ایک سرکلر جاری کیا کہ سارے تربیتی نصاب کا از سر نو جائزہ لے کر اسے اس طرح کے مواد سے پاک کیا جائے۔ جنرل کہتے ہیں کہ

"It was totally objectionable, against our values and it wasn't academically sound."

ترجمہ: یہ قطعی ناقابل قبول، ہماری تہذیبی روایات کے منافی اور تربیتی اعتبار سے بھی مناسب نہیں ہے۔

صاحبو! ٹھیک ہے، ہم مان لیتے ہیں کہ اسلام کے خلاف نفرت انگیز مواد کی شمولیت ملکی پالیسی کا حصہ نہیں ہے، لیکن اس انکشاف سے یہ تو بہر حال ثابت ہوتا ہے کہ نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کیسی کیسی گندی ذہنیت کے لوگ حصہ لے رہے ہیں۔ اس دوران یہ خبر ہمارے لیے خوش آئند ہے کہ ایک فوجی نے جنرل ڈیمپسے کی توجہ جوں ہی اس جانب مبذول کرائی انھوں نے نہ صرف اس طرح کے متنازعہ مواد کو نصاب سے خارج کرنے کی ہدایت جاری کر دی، بل کہ اس واقعہ کے پس پردہ عوامل کا سراغ لگانے کے لیے تحقیقات کا بھی حکم دے دیا ہے۔ میجر جنرل فریڈریک روڈیشم کے اعلان کے مطابق یہ تحقیق ۲۴ رمئی ۲۰۱۲ء سے قبل مکمل ہو جائے گی۔ لہٰذا موجودہ تناظر میں ہم امید کرتے ہیں کہ تحقیقاتی رپورٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد جنرل ڈیمپسے خاطیوں کو قرار واقعی سزا دیں گے تا کہ ہمیشہ کے لیے یہ سیاہ باب بند ہو جائے۔ دوسری بات یہ کہ موجودہ افسوس ناک انکشاف کے بعد یہ امر از حد ضروری ہو جاتا ہے کہ فوجی تربیت دینے والوں کے لیے بھی ضابطۂ اخلاق بنایا جائے اور تربیت کی ذمہ داری سونپنے سے قبل انھیں بھی اہلیت کے امتحان سے گزارا جائے۔

دل آزار فلم بنانے والا اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا

انسانی آبادیوں میں "جذباتی نعرے"، "متکبرانہ چال" اور "گرجتے لب و لہجے" اسلام کے نزدیک درست نہیں

تعلیماتِ اسلامی کا عملی مظاہرہ سینکڑوں تقاریر اور ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے محاسن و فضائل کے تذکرے پر بھاری ہے

محسنِ انسانیت سرکارِ دو عالم ﷺ کی ذات سے منسوب کی گئی دل آزار فلم امریکہ کی سرزمین پر بنائی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ جن بے بنیاد اور فرضی خیالات کے پس منظر میں اسے پیش کیا گیا ہے وہ بلا شبہ قابل مذمت بھی ہے لائقِ استنکار بھی۔ یہی وجہ ہے کہ رد عمل کے طور پر ساری دنیا میں احتجاجات ہو رہے ہیں۔ اپنے سر نامۂ سخن کے حوالے سے گفت گو کرنے سے قبل بہتر ہے کہ ہم ان عوامی احتجاجات پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لیں۔ سب سے پہلے جس ملک میں پر تشدد احتجاج ہوا وہ لیبیا تھا۔

۱۱ رستمبر ۲۰۱۲ء کے دن شہر بنغازی میں اپنے غم و غصہ کے اظہار کے لیے لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے امریکی سفارت خانے کی عمارت نشانے کی زد میں تھی۔ چند لوگ چہار دیواری پر چڑھ گئے اور دوسرے کھڑی گاڑیوں پر اپنا غم و غصہ نکالنے لگے۔ اسی دوران کسی نے عمارت کو آگ لگا دی۔ سفارت خانے کا بعض عملہ بری طرح پھنس گیا اور دھواں کے کثیف مرغولوں کی زد میں آ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا۔ اس طرح سفیر کے ساتھ ساتھ ان کے تین دوسرے ساتھی موت کا شکار ہو گئے۔

۱۸/ستمبر کو افغانستان کے شہر کابل میں غیر ملکی اسٹاف کو لے جانے والی بس پر خودکش حملہ کیا گیا جس میں کم از کم ۱۲/افراد لقمہ اجل بن گئے۔ اطلاعات کے مطابق حزب اسلامی نے اس کی ذمہ داری قبول کی۔ حزب اسلامی کے ترجمان زبیر صدیقی کے مطابق یہ حملہ اسی دل آزار فلم کے بنانے کا بدلہ لینے کے لیے کیا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ پولیس کی کئی گاڑیاں بھی نذرِ آتش کر دی گئیں۔

پاکستان میں اس فلم کی مذمت میں یومِ عشقِ رسول ﷺ کا اعلان کیا گیا۔ مسلمانوں نے جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے بعد سڑکوں پر مظاہرہ کیا۔ پاکستان کے ہر شہر میں لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور جن شہروں میں امریکی کاؤنسلیٹ کی عمارتیں تھیں وہاں تک مظاہرین نے پہنچنے کی کوششیں کیں۔ اس دوران ملک کی پولیس سے محاذ آرائی ہوگئی اور ۱۹/افراد مختلف شہروں میں لقمۂ اجل بن گئے۔ ساتھ ہی ساتھ عمارتیں، سرکاری گاڑیاں اور کئی دوسری املاک کو شدید نقصان پہنچا۔

انڈونیشیا کے دار الحکومت جکارتہ میں سینکڑوں افراد نے پرتشدد جلوس میں شرکت کی اور پٹرول بموں سے عمارتوں پر حملہ کیا۔

سوڈان کے سرکاری ریڈیو کے مطابق تین افراد اس وقت ہلاک ہوگئے جب مظاہرین نے امریکی سفارت خانے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔

تیونس میں مظاہرین کسی قدر مشتعل ہوگئے اور امریکی سفارت خانے کے احاطے میں داخل ہونے لگے کہ اتنے میں سیکیوریٹی فورسیز نے فائرنگ کر دی جس کے نتیجے میں دو افراد ہلاک ہوگئے۔

اسی طرح مصر اور لبنان میں ہونے والے پرتشدد مظاہرے میں ایک ایک شخص ہلاک ہوا۔ لبنان میں امریکی فاسٹ فوڈ کا مشہور ریسٹورانٹ کے ایف سی کو مظاہرین نے پوری طرح جلا کر راکھ کر دیا۔

کولمبو اور بنگلہ دیش میں بھی لوگوں نے مظاہرہ کیا۔ اسی طرح کے جذباتی مظاہرے دنیا کے دیگر شہروں میں بھی ہوئے، جن میں گو کہ کوئی جانی نقصان نہ ہوا، لیکن سرکاری املاک

اور مقامی لوگوں کی ذاتی عمارتوں کو کسی نہ کسی حیثیت سے نقصان ضرور پہنچا ہے۔

متذکرہ افسوس ناک فلم کے نتیجے میں دنیا کے مختلف گوشوں میں ظہور پذیر ہونے والے مظاہروں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ آپ نے ڈال لی۔ یہ کہنا قرین قیاس ہے کہ پرتشدد مظاہروں کی یہ فہرست کسی طور استیعابی نہیں کہی جاسکتی، بل کہ اس میں تو صرف انھیں شامل کیا گیا ہے جن کا انعقاد دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں ہوا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہیں کہ اگر اس فہرست میں دنیا کے ہر ایک مظاہرے اور اس کے نتیجے میں ہونے والے جانی اور مالی نقصانات کی شمولیت ہو جائے تو ہماری توقعات سے کہیں زیادہ حیرت ناک حقیقت ہمارے سامنے آئے گی۔

اب ذرا غور کریں کہ یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ ظلم و زیادتی کوئی دوسرا کرے اور ہم اس کی زیادتی کے خلاف اس قدر مشتعل ہو جائیں کہ خود اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ بھی ہمیں تکلیف پہنچائے اور ہم بھی خود اپنے آپ کو تکلیف پہنچائیں، وہ بھی ہمیں دکھ دے اور ہم بھی اپنے آپ کو دکھ دیں۔ ہے نا بات عجیب و غریب!! کون کہتا ہے کہ باسلی نے یہ فلم سرکارِ ابد قرار ﷺ کی شانِ اقدس گھٹانے کے مقصد سے بنائی ہے؟ مجھے صد فی صد اس بات سے اختلاف ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجیے کہ جب خدائے عظیم و قدیر خود اپنے محبوب کی شان بلند کرے تو کس کی مجال کہ وہ آپ کی شخصیت کو داغ دار کر سکے؟ اسی ہستی کے دست قدرت میں عزت و وجاہت کی ساری کنجیاں ہیں وہ جسے چاہتا ہے عز و شرف سے سرفراز فرما دیتا ہے۔ اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ اس طرح کی ناپاک جسارتوں سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ سرکار دو عالم ﷺ کی شان گھٹائی جائے، بل کہ دشمنوں کا اصل ہدف تو یہ ہوتا ہے کہ لوگ اسلام سے محبت کے بہ جائے نفرت کرنے لگیں، مذہب اسلام کی تصویر دنیا کے سامنے دھندلا جائے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو غیر مہذب بنا دیتا ہے، بے گناہوں کے قتل پر برانگیختہ کر دیتا ہے، سرکاری املاک کی تباہی و بربادی پر اسے کوئی رنج و افسوس نہیں ہوتا۔ اب ذرا اس آئینے کے رُو بہ رُو روئے زمین پر ہونے والے پرتشدد مظاہروں کو لا کھڑا کریں اور حقیقت پسندی کے ساتھ خاک و خون میں

ڈوبی ہوئی تصاویر کا تجزیہ کیجیے۔ آپ پکار اٹھیں گے کہ واقعی ہم نے اپنی حرکتوں سے دشمن کے ہاتھوں کو مضبوط کر دیا۔

سماعتِ حق کی سکت ہو تو سنیے کہ یہ موقع تو اسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کرنے کا تھا۔ دنیا ہماری جانب کان لگائے کھڑی تھی اور لوگوں کی نگاہیں ہماری جانب مرکوز تھیں۔ ہم پرامن مظاہروں کے ذریعہ اپنے مذہب کے ضابطہ اخلاق کی عملی تصویر دنیا کے سامنے پیش کر کے انھیں اسلام سے قریب کر سکتے تھے۔ یقین جانیے عملی تبلیغ ہی سب سے مؤثر ذریعہ دعوت و تبلیغ ہے۔ تعلیمات اسلامی کا عملی مظاہرہ سینکڑوں تقاریر اور ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے محاسن وفضائل کے تذکرے پر بھاری ہے۔ صد افسوس کہ ہم نے اپنے مذہب کے قوانین وضوابط کا خون خود کیا، لیکن احساس تک نہ ہوا۔ فرصت کے لمحات میسر آئیں تو غور کیجیے گا کہ وہ مذہب جو دوران جنگ درختوں کے بلاوجہ کاٹنے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرے وہ شان وشوکت کے ساتھ کھڑی ہوئی عمارتوں کی تباہی و بربادی اور گاڑیوں کے نقصانات کیوں کر پسند کر سکتا ہے؟ ایک ایسا مذہب جو ہر لمحہ نعمت خداوندی پر شکر وامتنان کے کلمات ادا کرنے کی تعلیم دیتا ہو وہ روئے زمین پر پھیلے ہوئے فضل ونعم کے مظاہر کی بیخ کنی کیوں کر برداشت کر سکتا ہے؟ کس نے کہہ دیا کہ انسانی آبادیوں میں ''جذباتی نعرے''، ''متکبرانہ چال'' اور ''گرجتے لب ولہجے'' اسلام کے نزدیک درست ہیں؟ یاد کیجیے جب سرکار دوعالم ﷺ نے میدان جنگ میں ایک صحابی کو اکڑ کر چلتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اللہ کے نزدیک اس طرح کی چال صرف میدان کارزار ہی میں روا ہے۔ مطلب بالکل واضح ہے کہ ہمارے نزدیک ''انسانی آبادی'' اور ''میدانِ کارزار'' میں واضح امتیاز ہونا چاہیے۔ ہم نے نادانستہ ان دونوں کے درمیان فرق کو مٹا دیا ہے۔ بلاشبہ جب آپ میدانِ جنگ میں کسی دشمن کے ساتھ نبرد آزما ہیں تو حوصلہ بڑھانے کے لیے جذباتی نعرے بھی لگائیے، غرور وتکبر کے ساتھ سینے پھلا کر بھی چلیے اور ضرورت محسوس ہو تو گرج دار لب ولہجے میں مخاطبت بھی کیجیے، لیکن جب آپ آبادیوں میں ہوں تو پھر لب ولہجہ شائستہ، چال میں اظہارِ عاجزی وانکساری اور آواز پر کشش ہونی چاہیے۔

صاحبو! ان پُرتشدد مظاہروں کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہم جس مذہب کی پاک دامنی وطہارت کے تحفظ کے لیے سڑکوں پر نکل آئے خود عملی طور پر اس مذہب کے ضابطہ وقوانین کی پاسداری نہ کر سکے۔ بہت ممکن ہے کہ جذباتی فکر کے حاملین میری گفت گو سے اتفاق نہ کریں، لیکن مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کا سنجیدہ طبقہ ضرور میری تلخ نوائی کو حقیقت وواقعیت کے پردے میں حرف بہ حرف درست تسلیم کرے گا اور یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ اس دل آزار فلم کا بنانے والا اس سرکارِ دوعالم ﷺ کی ذات گرامی کو داغ دار کرنے میں تو کام یاب نہ ہو سکا، لیکن ہمیں نقصان پہنچانے میں وہ ضرور کسی حد تک کام یاب ہو گیا ہے۔

اسے اظہارِ رائے کی آزادی نہیں کہہ سکتے

عالمی قوانین میں انسانوں کو دی جانے والی آزادیِ اظہار کی بھی حدیں متعین ہوتی ہیں

ایک بار پھر عالمِ اسلام بے چینی و اضطراب کے تنور سے اٹھتے ہوئے خوف ناک شعلوں کی زد میں ہے۔ لیبیا کی خاکستر سے اٹھنے والی چنگاری نے بڑی تیزی کے ساتھ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ لوگوں کا یہ غم وغصہ اور احتجاج بلا وجہ نہیں ہے، بل کہ اس بدنامِ زمانہ شخصیت کی نگرانی میں بننے والی دل آزار فلم کے ردعمل کی وجہ سے ہے جسے اس نے سرکارِ دوعالم ﷺ کی مقدس ذات سے منسوب کردیا ہے۔ سام باسل نامی کیلی فورنیا کا یہ رہائشی حقیقت میں بہروپیا ہے، جس کے ایک نہیں، کئی نام ہیں۔ پولیس کے مطابق ماضی میں اس نے کئی فرضی ناموں کا استعمال کیا ہے۔ جن میں **Nicola Bacily, Robert Bacily, Erwin Salameh, Ahmad Hamdy, Kritbag Difrat, PJ Tobacco** وغیرہ شامل ہیں۔ اس نے دل آزار ویڈیو کے اخراج پر اپنا نام سام باسلی بتایا تھا اور عالمی سطح پر غم وغصہ کے اظہار کے بعد روپوش ہوگیا تھا، لیکن ناقابلِ انکار شواہد کی بنیاد پر مبینہ شخص کو ڈھونڈ نکالا گیا۔ ہوا یہ تھا کہ اس نے **Morris Sadek** نامی ایک قبطی عیسائی کو فون کیا تھا اور اس کی ویب سائٹ پر اپنی فلم کی تشہیر کی گزارش کی تھی۔ جب پولیس نے اس فون نمبر کی رہ نمائی پر تفتیش شروع کی تو یہ نمبر اس شخص تک لے گیا جس کا نام **Nikoula Basseley Nakoula** ہے، لیکن ملاقات پر اس نے صاف انکار کردیا وہی سام باسلی ہے۔ زور دینے پر اس قدر اعتراف کیا کہ وہ سام باسلی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اپنے گھر کے باہر صحافیوں کے ساتھ گفت گو کے دوران اس

نے جو شناختی کارڈ دکھایا اس پر مکتوب درمیانی نام ''باسلی'' کو اپنے انگوٹھے سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ بہ ہر حال جھوٹ کا پردہ جلد ہی فاش ہوا اور اسے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ کیلی فورنیا کی پولیس کے مطابق یہ شخص ۲۰۱۰ء میں بینک کے ساتھ فریب دہی کی واردات میں ملوث رہا ہے۔ جس کی پاداش میں ۷،۹۰۰۰۰ ڈالر اور ۲۱ ماہ کی قید وبند نیز پانچ سال تک انٹرنیٹ اور کمپیوٹر بغیر اجازت استعمال نہ کرنے کی سزا دی جاچکی ہے۔ **Asst. Attorney Jennifer Willia** کے مطابق اس نے مسروقہ سوشل سیکیوریٹی نمبر اور فرضی شناخت کے ذریعہ بینک میں کئی اکاؤنٹ کھول رکھے تھے اور بغیر رقم جمع کیے اپنے دوسرے اکاؤنٹ میں اسے منتقل کردیا کرتا تھا۔ پھر قبل اس کے کہ بینک کے ڈاٹا میں اصل حقیقت ظاہر ہوتی یہ شخص رقم نکال لیا کرتا تھا۔ اس شخص پر منشیات کی اسمگلنگ کے الزامات بھی عائد ہوچکے ہیں۔

بہ ہر کیف میری اس گفت گو سے مذکورہ بالا شخص کی سیرت بیان کرنا مقصود نہیں، بل کہ مدعا صرف اس قدر ہے کہ ہم ماضی کے آئینے میں اس کا اصلی چہرہ دیکھ سکیں۔ بلاشبہ یہ شخص بڑا ہی شاطر، پُرفریب اور مجرمانہ ذہنیت کا مالک ہے، جسے عدل و انصاف اور حقیقت و واقعیت کے ساتھ جینے کی عادت ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح یہ دنیا کی دولت سمیٹنے کی خاطر ماضی میں جرائم کا ارتکاب کرتا رہا ہے، ٹھیک اسی طرح اس نے مذکورہ بالا دل آزار فلم کے ذریعہ سستی شہرت اور عارضی دولت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

سرکارِ دوعالم ﷺ کی مقدس سیرتِ پاک کو داغ دار کرنے کی یہ کوشش کوئی نئی نہیں ہے، بل کہ ماضی میں بھی اس طرح کی ناکام کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ چند سال قبل ڈنمارک میں -نعوذ باللہ- مضحکہ خیز کارٹون کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس طرح کے قابلِ مذمت حادثات کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جب بھی عالمِ اسلام میں لوگ اس طرح کی حرکتوں پر احتجاج کرتے ہیں تو مغربی حکومتیں بڑی آسانی سے کہہ دیتی ہیں کہ ہمارے یہاں ''اظہارِ رائے کی آزادی'' ہے، لہٰذا ہم کوئی قانونی کارروائی نہیں کرسکتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی کسی مذہبی شخصیت کی دل آزاری کے لیے یہ عذر قابلِ قبول ہوسکتا ہے؟ بلاشبہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے تو جواب قطعی نفی میں ہوگا ہی، لیکن حیرت سے

دو چند ہونے کی بات یہ ہے کہ غیر جانب داری کے ساتھ بھی اگر کوئی اس ''عذرِ لنگ'' پر غور کرے تو نتیجہ یہی نکلے گا۔

ذرا سوچیے تو سہی کہ مغربی ممالک جو کہ ''آزادیِ حقوق'' کی راگ الاپتے نہیں تھکتے وہاں بھی ''آزادی'' کی حدیں متعین ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی اپنے ملک کا جھنڈا سرِعام پیر سے کچلے تو کیا اسے ''حقِ اظہارِ رائے'' کی وجہ سے چھوڑ دیا جائے گا؟ اسی طرح اگر کوئی سر پھرا اپنے ملک کے قوانین کو نذرِ آتش کرنا چاہے تو کیا اسے اس بات کی اجازت دے دی جائے گی؟ یوں ہی جو چیزیں ملکی وقار و تمکنت کی علامت تصور کی جاتی ہیں، ان کی بے حرمتی کے دوران کیا انتظامیہ کے افراد خاموش تماشائی بنے رہیں گے؟ یہ اور اس طرح کی کئی مثالیں زیرِ بحث موضوع کے پس منظر میں دی جا سکتی ہیں اور یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان کی ''مبینہ آزادی'' بھی بہت سارے قیود کے ساتھ مشروط ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ''اظہارِ رائے کی آزادی'' کی وجہ سے مجرمین کی حرکتوں پر لگام نہیں کسا جا سکتا، قطعی بے بنیاد ہے۔

اب آیئے ہم اسے دوسرے پہلو سے دیکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ آپ کے یہاں ''اظہارِ رائے کی آزادی'' کے سبب ایسے افسوس ناک واقعات کے پس پشت عناصر کو عدالت کے کٹہرے میں لانا ممکن نہیں۔ جرائم اور مجرمین کے حوالے سے بنے ہوئے عالمی قوانین پر غور کریں۔ سوال یہ ہے کہ کیا صرف جرم کرنے والے کو سزا دی جاتی ہے یا اسے بھی مجرم سمجھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے جرم پر حوصلہ افزائی ہوئی ہے؟ اس بات کو ایک سادہ سی مثال کے ذریعہ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کسی مقرر نے مجمعِ عام میں اشتعال انگیز تقریر کر دی جس کی وجہ سے چند لوگ غصے میں آ گئے اور فساد پھوٹ پڑا۔ خدارا بتایئے کہ عدالت کی نگاہ کیا صرف فساد پھیلانے والے مجرم ٹھہرائے جائیں گے یا ساتھ ہی ساتھ اشتعال پھیلانے والے مقرر سے بھی مواخذہ کیا جائے گا؟ ظاہر ہے دونوں مجرم گردانے جائیں گے۔ فساد پھیلانے والوں پر جرم کرنے کا الزام عائد کیا جائے گا اور مقرر پر جرم کے لیے اکسانے کی کوشش کا الزام عائد ہوگا۔ اسی تسلیم شدہ منطق کو اب ذرا متذکرہ افسوس ناک واقعہ پر چسپاں کر کے دیکھیے۔

ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ کی مقدس سیرت کو داغ دار کرنے کی ناپاک جسارت کی اور پوری دنیا میں آگ لگ گئی۔ بے شمار عمارتیں نذرِ آتش کر دی گئیں، کئی بے گناہ مارے گئے اور بڑی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔ لہٰذا عدل و انصاف کے تقاضے پکار رہے ہیں کہ صرف انھیں ہی مجرمین کی فہرست میں شامل نہ کیا جائے جنھوں نے نقصان پہنچایا ہے، بل کہ اسے بھی تو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کریں جس کی دل آزار حرکتوں کی وجہ سے دنیا کا امن و امان خطرے میں پڑ گیا ہے۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر کیوں صرف انھیں انصاف کے کٹہرے میں لانے کی باتیں کی جاتی ہیں جو مادی نقصانات کے پس پشت ہیں اور انھیں کیوں چھوڑ دیا جاتا ہے جو ان نقصانات کے اصل محرکین ہیں؟ سچی بات کہوں کہ صرف ''بم'' پھینکنے والوں کو سزا دینا اور ''بم ہاتھ میں تھمانے والوں'' کو آزاد چھوڑ دینا ایسا ہی ہے جیسے سیلاب کی تیز و تند روانی کو روکنے کی کوشش کی جائے اور جس باندھ کے ٹوٹنے کے سبب سیلاب آیا ہے اسے یوں ہی کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ کام یابی ہرگز نہیں مل سکتی۔

معاف کیجیے گا میری مندرجہ بالا مثال سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ مَیں پر تشدد احتجاج کی حمایت کر رہا ہوں۔ تشدد اور قتل و غارت گری کا تو ہمارا مذہب قائل ہی نہیں ہے، وہ تو اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ غلط حرکتوں کا جواب بھی دیا جائے تو ضابطے کی پابندی کے ساتھ۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دنیا کو اگر جائے امن و سکون بنانے کی خواہش ہے تو پھر ہمیں ہر طرح کی اشتعال انگیزی پر پابندی عائد کرنی پڑے گی۔

صاحبو! مَیں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے افسوس ناک واقعات کو ہمیشہ کے لیے جڑ سے ختم کرنے کی خاطر عالمی سربراہی کانفرنس ہونی چاہیے جہاں سبھی بہ یک زبان یہ طے کریں کہ جس طرح اپنے اپنے ملکوں میں ہزار طرح کی آزادی کے باوجود چند مستثنیات بہ ہر حال ہیں، ٹھیک اسی طرح مذہبی دل آزاری کو بھی ''صریح جرم'' قرار دیا جائے اور ایسے عناصر کے خلاف مقدمہ دائر کر کے انھیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ کاش یہ حقیقت اربابِ اقتدار پر اب بھی روشن ہو جائے تو اہانتِ اسلام کا یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو سکتا ہے۔

ہر بات کا ہے دار و مدار اپنی ذات پر
گر ہم خراب ہیں تو زمانہ خراب ہے

عالم عرب

آزادیِ فلسطین کے لیے ایک منظّم لائحہ عمل ضروری

فلسطین کے مفاد کی بات ہو تو ہم غیر جانب دار ہیں
اور جہاں اسرائیل کے مفاد کے تحفظ کا سوال ہو تو خم ٹھونک کر میدان میں

قبلۂ اول بیت المقدس اب بھی غیروں کے قبضہ میں ہے۔ اس کی آزادی کے لیے برسوں سے تحریکیں چل رہی ہیں۔ الفتح، حماس اور فلسطینی لبریشن آرگنائزیشن کے بینر تلے فلسطین کے مسلمان اپنے طور پر جدوجہد کر رہے ہیں۔

ابتدا میں ہتھیار سے لیس ہو کر یہودیوں کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف جنگ چھیڑی گئی، پھر وہ وقت بھی آیا جب یاسر عرفات نے ''ثورۃ الحجارۃ'' نامی تحریک شروع کی جس کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے بچے یہودی فوجیوں پر ہتھیار نہیں بل کہ سڑکوں سے پتھر اٹھا کر پھینکتے رہے۔ نائن الیون کے حادثے کے بعد جب افغانستان اور عراق پر فوج کشی ہوئی تو دنیا بھر کے انصاف پسند لوگوں نے مسئلہ فلسطین کے حل کے لیے عالمی برادری پر زور دینا شروع کیا، جس کے نتیجے میں اسرائیل کے سب سے بڑے حمایتی امریکہ نے کروٹ بدلی اور فلسطینیوں کی ایک جزوی خود مختار حکومت ضرور قائم کر دی گئی، لیکن آنے والے حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ صرف دنیا کو دکھانے کے لیے ''کاغذی خود مختار'' ریاست تھی جس کی باگ ڈور عملی طور پر بہ ہر حال اسرائیل کے ہاتھ میں رہی۔ اس نے اپنی مرضی کے مطابق جب بھی چاہا اسے ڈھیل دے دی اور جب چاہا اسے کھینچ لیا۔ یعنی اب یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ فلسطینیوں کے ساتھ ''کھلی ناانصافی'' ہو رہی ہے اور یہ بھی نہیں کہ انھیں ''پوری آزادی'' حاصل ہے۔

موجودہ صورت حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فلسطین کی آزادی کس طرح حاصل کی جائے؟ ماضی میں چند عرب ممالک کی مشترکہ فوج کشی بری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب مسلح جدوجہد کی کوئی کوشش شاید حاشیہ ذہن میں بھی نہ ہو۔ ویسے بھی عالم عرب کے کئی ایک ممالک پوری طرح عالمی برادری کے زیر تصرف ہیں۔ وہ اپنے آقاؤں کے اشارۂ ابرو کے خلاف کچھ کرنا تو دور کی بات ہے، ان کی مرضی کے خلاف سوچنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لیبیا میں میرے زمانہ طالب علمی کے وقت سابق سوویت یونین اور امریکہ کے سربراہوں کے مابین چوٹی کانفرنس ہونے والی تھی۔ عرب لیگ نے مسئلہ فلسطین کے حوالے سے اپنی بے چینی کے اظہار کے لیے عرب ممالک کے سربراہوں کا ایک اجلاس طلب کر لیا۔ دو دنوں تک کانفرنس چلتی رہی اور بات طے ہوئی کہ ایک مشترکہ قرارداد پاس کر کے امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان ہونے والی چوٹی کانفرنس میں بھیجا جائے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فلسطین کی آزادی کے لیے کوئی فعال کردار ادا کرنا تو دور کی بات ہے، عرب سربراہان کے لیے قرارداد کے متن پر اتفاق کرنا مشکل ہو گیا اور آپسی اختلافات اس قدر وسیع ہو گئے کہ کانفرنس کو ہنگامی طور پر مزید ایک دن کے لیے بڑھا دیا گیا۔ اس لیے موجودہ پس منظر میں عرب ممالک سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ وہ مستقبل قریب میں فلسطین کی آزادی کے لیے کوئی مسلح جدوجہد کی حمایت کریں گے۔

دوسری اُمید اقوام متحدہ سے ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے اقدامات کے ذریعہ فلسطینیوں کے مسائل حل کرے، لیکن یہ ادارہ بھی چند بڑی طاقتوں کے ہاتھوں میں یرغمال ہے۔ یہ طاقتیں اپنے اپنے مفاد کے پیش نگاہ اقوام متحدہ کی قراردادوں پر گرفت رکھتی ہیں۔ جب چاہا پیش کردہ قرارداد کو پاس کروا لیا اور جب چاہا اسے ویٹو کر دیا۔ اس پس منظر میں یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ''اقوام متحدہ'' اس وقت تک واقعی اقوام متحدہ ہے جب تک اس کے اقدامات سے بڑی طاقتوں کے مفاد کو نقصان نہ پہنچ رہا ہو اور جب کسی کے مفاد زد میں ہوں تو اس کی حیثیت پھر اقوام متحدہ کی نہیں رہتی بل کہ ''قوم متحد'' کی ہو جاتی ہے۔ اس تاریخی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ماضی میں امریکہ نے ہر اُس قرارداد کو ویٹو کیا ہے جو اسرائیل کی

اپنی پالیسی کے خلاف ہو۔ ابھی کی تازہ مثال لے لیں! فلسطین کے صدر محمود عباس ایک درخواست لے کر آئے کہ ان کے ملک کو بھی اقوام متحدہ کا ممبر بنالیا جائے۔ بس اتنی سی بات بھی بڑوں کو گوارا نہ ہوئی۔ امریکہ کے موجود صدر باراک اباما کی گفت گو کا یہ حصہ خود ان کے الفاظ میں سنیے:

" Peace will not come through statements and resolutions at the United nations. If it were that easy, it would have been accomplished by now......... Ultimately, it is the Israelis and the Palestinians -not us- who must reach agreement on the issues that divide them: on borders and on security, on regugees and Jerusalem." *(USA Today, page: 6A, 22 Sept, 2011)*

''اقوامِ متحدہ میں قرارداد پیش کر کے یا بیان بازی کے ذریعہ امن حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ اتنا ہی آسان ہوتا تو اسے اب تک حاصل کرلیا گیا ہوتا...... اسے ہر حال میں اسرائیل اور فلسطینیوں کے ذریعہ ہی حاصل کیا جاسکتا ہے نہ کہ ہمارے ذریعہ۔ انھیں اپنے مختلف فیہ امور جیسے حد بندی، امن و آشتی، مہاجرین کی واپسی اور یروشلم کے حوالے سے باہمی رضا مندی کے ذریعہ ہی حل نکالنا ہوگا۔''

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ کہی جارہی ہے کہ اقوامِ متحدہ کے پلیٹ فارم سے اگر فلسطین کا مسئلہ حل کرنا ممکن ہوتا تو یہ کب کا ہو چکا ہوتا۔ کیا یہی بات اُلٹ کر نہیں کہی جاسکتی کہ اگر دونوں کی آپسی گفت گو کے ذریعہ ہی مسئلہ کا حل ممکن ہوتا تو اب تک ایسا کیا جاچکا ہوتا۔ اس طرح کی گفت گو دراصل اپنی اخلاقی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنے کے مترادف ہے۔ کوئی بھی انصاف پسند غیر جانب دار ہو کر گفت و شنید کے ذریعہ مسئلہ کے حل کی سابقہ کوششوں کا جائزہ لے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ حقیقت میں اسرائیل

اپنے جارحانہ عزائم کی تکمیل کے لیے مزید وقت چاہتا ہے لہٰذا وہ فلسطینیوں کو مذاکرے کی دعوت دیتا رہتا ہے تاکہ دنیا کے سامنے ''مصنوعی فراخ دلانہ'' رویے کے اظہار کے ذریعہ اپنی ''ظاہری شکل وصورت'' کسی قدر بہتر بنا سکے۔ میری یہ رائے محض کسی ظاہری بغض وعناد پر مبنی نہیں ہے بل کہ مقبوضہ فلسطین کے زمینی حقائق اسی بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

اس حوالے سے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسرائیلی صدر نے محمود عباس کو دعوتِ مذاکرہ دیتے ہوئے اس بار بھی کہا ہے کہ وہ بغیر کسی پیشگی شرط کے آئیں اور مذاکرے کی میز پر بیٹھ جائیں۔ یعنی محمود عباس نے مذاکرہ سے پہلے اسرائیل کے ذریعہ مقبوضہ فلسطینی علاقے میں نئی اسرائیلی آبادکاری کے موقوف کرنے کی جو شرط رکھی ہے اسے چھوڑ دیں۔ یہ بات کیسی مضحکہ خیز ہے کہ جس زمین کی ملکیت متنازع فیہ ہے اسے ہڑپتے بھی رہو اور اسی پر مفاہمانہ گفت گو بھی جاری رکھو، یعنی چوری بھی جاری رہے اور چوری کے روکنے کی گفت گو بھی۔ پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ اسرائیل تو یہ کہتا ہے کہ محمود عباس کوئی پیشگی شرط نہ رکھیں اور خود مہاجرین کی واپسی، نئی آبادکاری اور یروشلم وغیرہ کے حوالے سے کئی ایک پیشگی شرائط وہ خود رکھ چکا ہے۔ اسی لیے فلسطینی فریق کی اہم رکن حنان عشراوی نے نہایت ہی خوب صورت بات کی کہ اسرائیل گفت گو کے سارے دروازے خود ہی بند کرتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ آیئے بات کریں۔

بہ ہر کیف موجودہ حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہنا بجا ہوگا کہ فلسطینی قیادت کو چاہیے کہ وہ دنیا کے ذی فہم مسلمانوں کو دعوت دے تاکہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور تحریک فلسطین کے لیے کوئی قابلِ قبول حل نکالیں۔ ایسا حل جو محض جوش وجذبے پر مبنی نہ ہو بل کہ قابل عمل بھی ہو۔ کوئی مضبوط لائحہ عمل بنائے بغیر سراب کے پیچھے بھاگتے رہنا دانش مندی نہیں ہے۔ اسی طرح مسئلہ فلسطین کے حل کے حوالے سے بڑی طاقتوں سے بھی بہت زیادہ پر امید رہنا مناسب نہیں۔ تازہ مثال آپ کے سامنے ہے کہ امریکی صدر باراک اباما ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ اسرائیل اور فلسطین خود آپسی مفاہمت سے اپنے مسائل حل کریں اور دوسری طرف صدر محمود عباس کے ذریعہ اقوام متحدہ میں فلسطین کی رکنیت کے حوالے سے پیش کی جانے والی درخواست کو ویٹو کرنے کی بات بھی کرتے ہیں۔ یعنی فلسطین کے مفاد کی بات ہو تو

ہم غیر جانب دار ہیں اور جہاں اسرائیل کے مفاد کے تحفظ کا سوال تو خم ٹھونک کر میدان میں۔

صاحبو! میری اس گفت گو سے مقصود صرف اتنا ہے کہ آزادیِ فلسطین ہمارے لیے اہم ہے تو اس حوالے سے کسی مناسب طریقہ کار کا تعین بھی نہایت اہم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا کے سامنے اپنی مظلومیت کے اظہار کے لیے اقوامِ متحدہ کا سہارا لینا حکمت عملی کا حصہ ہے، لیکن اسے ہی ایک بڑی کام یابی سمجھ لینا مناسب نہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ صدر محمود عباس جب اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کے بعد اپنے وطن واپس لوٹے تو ان کا فاتحانہ استقبال کیا گیا اور بڑے بڑے مظاہرے کیے گئے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، لیکن اس کے بعد کے اقدامات پر بھی غور کرنا نہایت ضروری ہے۔

شام کے حوالے سے عرب لیگ کے اِقدامات خوش آئند ہیں

اگر عرب لیگ شام کے مسئلے کو افہام و تفہیم سے حل کروالے
تو عالمِ اسلام کے لیے اسے سنہرے باب کا آغاز سمجھا جائے گا

"عرب لیگ" کہنے کے لیے تو عرب ممالک کی سب سے بڑی نمائندہ تنظیم ہے، لیکن زمینی حقائق کی بنیاد پر اس کی کارکردگی کا سراغ لگایا جائے تو یہ بات دوپہر کی دھوپ کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ اس کی ساری توانائیاں زیادہ تر "قراردادوں" تک ہی محدود ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی ممبر ممالک کے درمیان کوئی آپسی نزاعی مسئلہ ہو یا خارجی تشویش ناک صورت حال، عرب لیگ کی ہنگامی نشست تو ضرور ہوتی ہے، لیکن وہ اپیلوں تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ عراق اور کویت کے درمیان سرحدی تنازعہ کی بنیاد پر ہونے والی جنگ میں بھی عرب لیگ نے عراق سے باہمی گفت و شنید کے ذریعہ مسائل کے تصفیہ کے لیے درخواست ہی کی تھی۔ فلسطینی مسئلہ پر بھی آئے دن سربراہی اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔ سارے عرب کے ذمہ داران جمع ہوتے ہیں، کئی دنوں تک بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے اور بات "گزارشات" پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔

ان تاریخی حقائق کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ گزشتہ روز عرب لیگ نے شام کے خلاف جس طرح کے عملی اقدام کی دھمکی دی ہے، وہ عرب لیگ کو ایک نئے دور سے آشنا کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ شام کی رکنیت منسوخ کرنا ہی سب کچھ نہ سمجھ لیا جائے، بل کہ اس کے باوجود اگر شام کی حکومت اپنے شہریوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کرتی تو مزید اقدامات بھی زیر بحث رہنا چاہیے، کیوں کہ

عرب لیگ سے رکنیت کا منسوخ ہو جانا، ملک کے وقار کو مجروح تو کرتا ہے، لیکن عملی سطح پر اس کے کوئی خاص نقصانات ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر کے صدر انور سادات نے جب اسرائیل کو تسلیم کرتے ہوئے سفارتی تعلقات بحال کر لیے تو عرب لیگ نے مصر کی رکنیت منسوخ کر دی تھی، جس کا کوئی اثر اس کی صحت پر نہیں ہوا ہے۔ اس لیے عرب لیگ کے ذمہ داروں کے حاشیۂ ذہن میں یہ رہنا چاہیے کہ عرب لیگ کے قراردادوں کی حیثیت اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک کہ وہ مضبوط اور با اثر ادارہ نہیں ہو جاتا۔ ایسا ادارہ جو تمام ممبر ممالک کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی مسائل میں بہت حد تک دخیل ہونے کی صلاحیت رکھے۔

ایسی خبریں آ رہی ہیں کہ عرب لیگ کے ممبر ممالک اپنے سفرا کو شام سے یا تو واپس بلا رہے ہیں یا پھر عملہ کے ارکان میں کمی کے اشارے دے رہے ہیں۔ بلاشبہ دنیا میں کسی کے خلاف پرامن احتجاج کا یہ ایک مہذب طریقہ ہے۔ لیکن یہ بھی پیش نگاہ رہے کہ مہذب طریقہ احتجاج اسی ملک پر اثر انداز ہو سکتا ہے جس کے ذمہ دار "باغیرت"، "حساس" اور "باضمیر" ہوں، مگر وہ جس کی رگ رگ میں سرکشی، تعنت، بغاوت اور ظلم و تشدد سرایت کر چکا ہو، اس پر اس طرح کے اقدامات سے خاطر خواہ نتائج کی امید رکھنا فضول ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس بے دردی کے ساتھ حکومت کی سرپرستی میں نہتے مظاہرین پر گولیوں کی بوچھاڑ کی جا رہی ہے......... آئے دن اپنے شہریوں کے گھروں کو بموں سے نشانہ بنایا جا رہا ہے......... یہ تو بس وہ اطلاعات ہیں جو صحافتی آزادی پر قدغن لگانے والوں کے آہنی پنجوں سے پھسل کر ہم تک پہنچ رہی ہیں، ورنہ ظلم و ستم، درندگی و سفاکی اور تشدد و بربریت کے کیسے کیسے دل دہلا دینے والے حادثات سے لوگ دوچار ہیں، اس کی ہمیں کیا خبر کہ شامی حکومت نے اپنی سخت پالیسی کے مطابق ملک میں عالمی ذرائع ابلاغ کے داخلے پر پابندی عائد کر رکھی ہے......... یعنی حکومتی سرپرستی میں نہتے مظاہرین پر ظلم ہو اور آزادی کے ساتھ کہ کوئی دیکھنے والا ہی نہیں......... جنازے کے خاموش جلوس پر ٹینکوں کے منہ کھول دیے جائیں اور بے خوف و خطر کہ کوئی دست گیری کرنے والا ہی نہیں......... آبادی

کی آبادی تہس نہس کر دی جائے اور دوپہر کی دھوپ میں کہ دور دور تک کسی سائبان کی کوئی امید ہی نہیں......... خواتین کے سروں سے چادرِ عصمت کھینچ لی جائے اور کمال بے شرمی کے ساتھ کہ کسی محافظ کے دستک دینے کی توقع ہی نہیں۔

ذرا سوچیے کہ کیا ایسی حکومت غیرت مند کہلانے کی مستحق ہے؟ خیال رہے کہ ملک کے صدر بشار الاسد کی رگوں میں اسی باپ کا خون دوڑ رہا ہے، جو بندوق کی نوک پر برسوں اقتدار پر قابض رہے۔ ان کے خوف و دہشت کا عالم کیا تھا اس کا حال تو وہاں کے شہری ہی بتا سکتے ہیں۔ میں تو صرف اس کی ایک ادنیٰ سی جھلک دکھا سکتا ہوں، جس کا گواہ میں خود ہوں۔

ہوا یہ کہ لیبیا میں ہمارے ہم سبق چند شامی طلبہ بھی تھے۔ ایک دن بات نکل گئی اس وقت کے موجودہ صدر حافظ الاسد کی۔ ہم نے دیکھا کہ جتنے شامی طلبہ بیٹھے تھے، سبھی ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہو گئے۔ ہمارے ایک ساتھی نے حافظ الاسد کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تو شہر حمص کے عوامی احتجاج کو بڑی ہی بے دردی کے ساتھ کچل دیا تھا، جس میں ہزاروں لوگ لقمہ اجل بن گئے تھے۔ یقین جانیے یہ سنتے ہی سب کے سب پہلو تہی کرتے ہوئے اسے خلافِ واقعہ کہنے لگے۔ یہ بات ہمارے لیے بڑی ہی عجیب و غریب تھی کہ اتنی بڑی تاریخی حقیقت کو کس طرح خود وہاں کے حاضر باش جھٹلا رہے ہیں۔ بہرکیف بات آئی گئی اور ختم ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد جب میں ان شامی طلبہ میں سے ایک کے ساتھ دوپہر کے کھانے کے لیے مطعم جا رہا تھا تو بات پھر حافظ الاسد کی ایما پر کیے جانے والے ظلم و تشدد، جور و استبداد اور قتل و غارت گری کے حوالے سے نکل پڑی۔ دورانِ گفت گو میں ناگواری کے ساتھ بول پڑا کہ تم بھی کس قدر بے حس ہو کہ مسلمانوں پر ہونے والی ناانصافیوں پر صدائے احتجاج بلند کرنا تو درکنار تم سب ظالمانہ کارروائیوں پر مصنوعی پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہو۔ میں نے اپنا جملہ ابھی مکمل بھی نہ کیا تھا کہ وہ کہہ پڑا کہ شیخ غلام زرقانی! تم واقعی سچ کہتے ہو۔ گذشتہ روز تمہارے ساتھی نے شہر حمص پر حکومت کی سرپرستی میں ہونے والے جس وحشیانہ بربریت کی طرف اشارہ کیا تھا وہ نہ صرف حرف بہ حرف درست ہے بل کہ حقیقت میں وہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ اس

اعتراف حقیقت پر میں ہکا بکا رہ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کل صدر حافظ الاسد کی پرزور حمایت اور آج انہی کے لیے مذمت کے کلمات۔ میں استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا کہ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کل جب ہم سارے شامی طلبہ اکٹھے تھے تو وثوق کے ساتھ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ہمارے درمیان کون حکومت کا جاسوس ہے۔ بس یہی وجہ تھی کہ ہم سب نے عافیت اسی میں سمجھی کہ حکومت کے خلاف زبان نہ کھولی جائے، اس لیے کہ اگر حکومت کے ذمہ داروں تک یہ بھنک بھی لگ گئی کہ میں نے ان پر تنقید کی ہے تو وہ نہ صرف مجھے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے بل کہ ہمارے ساتھ ہمارے اہل خانہ بھی قصہ پارینہ بن جائیں گے۔

خوف و دہشت کا عالم ملاحظہ کیجیے کہ ایک مظلوم اپنے وطن سے ہزاروں کیلو دور ہے، لیکن حکومت کی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرنا تو دور کی بات ہے، وہ اعترافِ حقیقت کی جرأت بھی اپنے اندر محسوس نہیں کرتا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب اتنی دوری سے خوف و ہراس کے اثرات کا یہ عالم ہے تو ان لوگوں کی حالت زار کا صحیح ادراک کون کر سکتا ہے جن کے شب و روز اسی بھیانک سائے تلے گزر رہے ہیں؟

صاحبو! عرب لیگ سے ہم قطعی مایوس نہیں ہیں۔ اگر اب بھی یہ تنظیم واقعی فعال و متحرک ہو جائے تو اپنی زمین میں غیروں کی دخل اندازی روکی جا سکتی ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے کہ آپسی مسائل ہم خود حل کریں۔ اس میں شک نہیں کہ غیر جب بھی ہمارے علاقے میں داخل ہوتے ہیں، انسانی ہمدردی جیسے بلند بانگ دعووں کے پس پردہ ان کے اپنے مفاد پیش نگاہ ہوتے ہیں۔ معذرت کے ساتھ رازداری میں ایک بات کہوں .... یہ سچ ہے کہ غیر ہمارے معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں تو ہمیں نہایت ہی ناگوار گزرتا ہے، لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ موقع بھی تو ہم ہی انھیں فراہم کرتے ہیں۔ گھر کی لڑائی اگر گھر کی چہار دیواری کے اندر سلجھا لی جائے تو پڑوسی کیوں کر ہمارے درمیان کودے گا؟

حرمین شریفین کی آڑ میں انتقامی سیاست نہ کھیلی جائے

مسلمانوں کا مرکزِ عقیدت جائے امن و سکون ہے،
خدارا! اسے تو سیاسی مفادات کی بھینٹ نہ چڑھائیں!

کہتے ہیں کہ اگر اپنے ہی اپنوں پر زیادتیاں کرنے لگیں تو پھر غیروں کی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ بلاشبہ عالم اسلام کے موجودہ حالات کے تناظر میں یہ بات صدفی صد درست دکھائی دیتی ہے۔ کہنے کو تو سعودی عرب میں ''قانونِ اسلامی'' کا نفاذ ہے، لیکن سچ پوچھیے تو وہاں ''قانونی مفاد پرستی'' ہی رائج ہے، جو یہ نہیں دیکھتا کہ حق کس کے ساتھ ہے، بل کہ توجہ یہ رہتی ہے کہ ''ذاتی مفادات'' کے لیے بہتر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب سے لوٹنے والے مزدور طبقے سے اگر گفت گو کی جائے تو ایسی ایسی روح فرسا داستانیں پردۂ سماعت سے ٹکراتی ہیں کہ آنکھیں اشک بار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اطلاعات کے مطابق سعودی عرب میں آدھے سے زیادہ کام کرنے والے غیر ملکی ہیں۔ طے شدہ ضابطے کے مطابق کسی بھی غیر ملکی کو اس وقت تک داخلے کا ویزہ نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ وہ اپنے لیے کسی ضمانت دینے والے کو تلاش نہ کر لے، جسے قانون کی زبان میں ''کفالہ'' کہا جاتا ہے اور جو ضمانت دے اسے ''کفیل'' کہتے ہیں۔ ''کفالہ'' کے اس نظام کی وجہ سے ہونے والی زیادتیوں، ظلم و تشدد اور بربریت کا سراغ لگائیں تو روح پکار اٹھتی ہے کہ عصر حاضر میں ''نظام کفالہ'' دراصل ''رواجِ غلامی'' کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اپنے کو ''آقا'' کہتے ہوئے شرم لگی تو اسے تبدیل کر کے ''کفیل'' کر دیا۔ اس طرح کے واقعات عام طور پر سنائی دیتے ہیں کہ کفیلوں نے اپنے مزدوروں سے سخت محنت و مشقت کرانے کے باوجود انھیں تنخواہ نہ دی اور جب

انھوں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو ظالموں نے پاسپورٹ بھی ان کے حوالے نہ کیا۔ میں ایک نوجوان کو جانتا ہوں جو جمشید پور کے علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے آٹو میکانک کی حیثیت سے بلایا گیا۔ وہاں پہنچنے پر اسے تپتے ہوئے صحرا میں اونٹوں کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری دے دی گئی۔ جب اس نے احتجاج کرتے ہوئے واپسی کا ارادہ کیا تو اس کا پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا۔ اس نے بتایا کہ یہ صحرا اس قدر غیر آباد علاقے میں تھا کہ دور دور تک آبادی کا نام ونشان نظر نہ آتا تھا۔ مزید برآں اس کا کفیل بلند وبالا چہار دیواری کو مقفل کردیا کرتا تھا۔ ایسے خوف ناک علاقے سے بھاگ نکلنا بھی آسان نہ تھا۔ نوجوان نے بتایا کہ جب محسوس ہونے لگا کہ واقعی ہم "غلام" بنا لیے گئے ہیں تو ہم نے ہمت کی اور ایک دن جان ہتھیلی پر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بہ ہر کیف کسی طرح ہندوستانی ایمبیسی سے رابطہ ہوا اور وہ واپس ہو سکے۔ اسی کے ساتھ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہاں ایسے ہزاروں مزدور مل جائیں گے جنھیں اپنی مدتِ اقامت کی توسیع کے لیے کسی کفیل کی مدد سے ویزہ کی تجدید کرانی پڑتی ہے۔ لہٰذا ان کا کفیل صرف دستخط کرنے کے عوض ان سے بھاری بھر کم روپے وصول کرتا ہے۔ اس طرح وہ معاشرہ جسے "قانونِ اسلامی" کے نفاذ کی سرزمین کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے، وہاں رشوت پروان چڑھ رہی ہے۔ یہ کوئی ایک دو واقعات ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ اچھے برے تو ہر جگہ ہوتے ہیں، لیکن اسے کیا کہیے کہ اعلیٰ عہدوں پر فائز کام کرنے والوں کے ساتھ تو اس طرح کی زیادتیوں کی خبریں عام نہیں ہیں، لیکن مزدور طبقے کے ساتھ یہ روزمرہ کے معمولات میں شامل ہے۔ ۲۰۱۰ء کے حقوق انسانی کی رپورٹ کے مطابق فروری کے مہینے میں تیس نیپالی صفائی مزدوروں نے تنخواہ نہ دیے جانے اور خراب رہائشی سہولیات کے خلاف احتجاج کردیا۔ نتیجے کے طور پر ان کے ویزے منسوخ کردیے گئے اور تین چار ماہ کی جیل کے بعد انھیں اپنے وطن واپس لوٹنا پڑا۔ مئی میں ظہران میں واقع جداول انٹرنیشنل کمپنی جو کہ شیخ محمد بن عیسیٰ الجار کی ملکیت ہے، کے مزدوروں نے تنخواہ نہ ملنے پر احتجاج کرتے ہوئے کام کرنے سے انکار کردیا۔ لہٰذا ان سب کے ویزے منسوخ کردیے گئے۔ اسی طرح ستمبر میں مکہ میٹرو کے مزدوروں نے اسٹرائک کردیا اور جون

میں ۲۰۰ فلپینی مزدوروں نے انصار ہاسپٹل میں کام کرنے سے انکار کردیا۔ اگست میں ایک سری لنکن خاتون کے جسم سے ایک درجن سے زائد سوئیاں نکالی گئیں جنھیں اس کے مالک نے لمبے گھنٹوں تک کام نہ کرنے کی پاداش میں مارتول سے جسم میں داخل کیے تھے۔ اس طرح کے سینکڑوں واقعات ہر سال ظہور پذیر ہوتے ہیں، جن کے عینی شاہدین ایشائی ممالک کے وہ سفارت خانے ہیں جہاں کثرت کے ساتھ اس طرح کی شکایات موصول ہوتی رہتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بل کہ سعودی حکومت تو اپنے شہریوں کو بھی صرف "صدائے احتجاج" بلند کرنے کی بھی سزائیں دیتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر اکتوبر ۲۰۱۰ء میں ایک جج نے **فھد الجحید** نامی ایک اخباری رپورٹر کو جیل اور کوڑے کی سزا دی۔ ان کا جرم صرف اس قدر تھا کہ انھوں نے شہر قبا میں بجلی کی عدم فراہمی پر احتجاج کرنے والوں کی تفصیلی رپورٹ اخبار میں دے دی تھی۔

ظاہر ہے کہ پورے ملک میں من مانی کرتے ہوئے برسوں گزر جانے کے بعد بھی جب کسی نے ہاتھ پکڑا نہیں تو ہمت مزید بڑھ گئی اور وہ ہاتھ جواب تک صرف اپنے شہریوں تک دراز ہوتے تھے، اس کا دائرہ بڑھ رہا ہے۔ گذشتہ ہفتے ہونے والا سانحہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اطلاعات کے مطابق احمد الغزاوی نامی مصری وکیل عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے حرمین شریفین گئے ہوئے تھے۔ انھیں ائرپورٹ سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان کی گرفتاری کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ شرعی عدالت نے ان کے غائبانے میں انھیں بادشاہِ وقت کے خلاف توہین آمیز کلمات کہنے کے جرم میں ایک سال کی قید اور بیس کوڑوں کی سزا سنائی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ احمد الغزاوی سعودی عرب میں کام کرنے والے مصریوں پر ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھاتے رہے ہیں اور حراست میں رکھے جانے والے مصریوں کے حوالے سے سعودی عرب کے بادشاہ کو بھی آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سعودی حکومت کی نگاہ میں کسی پر "ظلم و زیادتی" کرنا اس قدر سنگین نہیں جس قدر بادشاہ وقت کے خلاف "زبان کھولنا" ہے۔ کیا اسے ہی اسلام کہتے ہیں؟ یہ وہ "اسلام" تو ہرگز نہیں جسے ہمارے رسولِ مکرم ﷺ سے نسبت ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ کسی بھی ظلم و

زیادتی سے بڑا ظلم تو یہ ہے کہ کسی سے ''سسکنے''، ''رونے'' اور ''صدائے احتجاج بلند کرنے'' کا حق ہی چھین لیا جائے۔ اور اس میں شک نہیں کہ سعودی حکومت کے رائج شدہ خود ساختہ ضابطہ کے مطابق شہریوں کو کسی بھی مسئلے پر احتجاج کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یعنی جو بھی ہو رہا ہے خاموشی کے ساتھ برداشت کیجیے، برداشت کیجیے اور برداشت کیجیے بس۔ یقین نہ آئے تو سعودی عرب میں ہونے والے حالیہ احتجاج کے بعد وزارتِ خارجہ کی آفس سے شائع ہونے والا یہ بیان خون آلود نگاہوں سے پڑھیے جو میڈیا کے ذریعہ ساری دنیا میں سنا گیا:

"Regulations in the kingdom forbid categorically all sorts of demonstrations, marches and sit-ins ... as they contradict Islamic Sharia law and the values and traditions of Saudi society," said a ministry statement carried by SPA state news agency."

(My Fox, Atlanta, Net)

''سعودی مملکت کے قانون کے مطابق کسی طرح کے مظاہروں، جلوسوں اور دھرنوں کی اجازت نہیں، یہ اسلامی شریعت، سعودی معاشرے کی روایات اور اقدار کے صریح منافی ہیں۔''

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہوسِ اقتدار کے نشے میں اسلامی شریعت کے دامن کو کس بے غیرتی کے ساتھ آلودہ کیا جا رہا ہے؟ سوچتا ہوں تو دماغ پھٹنے لگتا ہے کہ ''فرماں روائے حرمین'' کا ناجائز تسلط ''عین شریعت'' اور ظلم و جبر، قہر و غضب اور حق تلفی کے خلاف بلند ہونے والی سسکیاں ''خلافِ شریعت''!

صاحبو! اس واقعہ کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ حج وعمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے جانے والے ایک مسلمان کو ''انتقامی سیاست'' کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ ہم سارے مسلمانوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ اسے معمولی سمجھنے کی غلطی سارے عالم اسلام کو مہنگی پڑ سکتی ہے۔ سنا تو یہ ہے کہ مذہبی پس منظر میں مکہ و مدینہ کی عظمت و

حرمت اس قدر ہے کہ یہاں بسنے والے انسان ہی نہیں جانوروں تک کو نشانہ بنانا جائز نہیں، لیکن پھر وہی بات کہ سعودی معاشرہ میں ''ذاتی مفادات'' کا خیال پہلے ہے پھر ''مذہبِ اسلام'' ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہ کہیں کہ سعودی حکومت تو ساری دنیا میں مساجد اور مدارس کے قیام میں دل کھول کر مدد کرتی ہے، لہٰذا ان کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے۔ اس حوالے سے یہ بات یاد رکھیے گا کہ مساجد و مدارس کا قیام بہ ہر حال ''مستحبات'' کے زمرے میں آتا ہے جب کہ کسی پر ظلم وزیادتی کرنا ''محرمات'' میں شمار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ارتکابِ محرمات کو امورِ مستحبات کے دیدہ زیب لباس سے ڈھانپا نہیں جا سکتا۔ ہم تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہیں کہ سعودی حکومت کسی ایک بے قصور مسلم پر زیادتی کے موقوف کرنے کے بدلے اگر دنیا کے سارے مسلمانوں کی امداد بند کرنا چاہے تو شوق سے کر لے، ہمیں ''امداد و تعاون'' کے مقابلے میں اپنے ایک مسلمان بھائی کی ''عزت و حرمت'' زیادہ عزیز ہے۔

عالمِ عرب میں عربی زبان کے ساتھ بے اِعتنائی

دینی سرمایہ اگر عربی زبان میں نہ ہوتا تو یہ زبان بھی کب کی قصہ پارینہ بن چکی ہوتی

طے شدہ پروگرام کے مطابق عمرہ وزیارت کی سعادت حاصل کرتے ہوئے مصر جانے کا اِتفاق ہوا۔ ہوش سنبھالتے ہی جامع ازہر کی علمی جلالت وجبروت کی شہرت کان میں پڑی اور اسی دن سے اسے دیکھنے کی خواہش نہاں خانہ دل میں پرورش پا رہی تھی۔ کہتے ہیں جذبہ صادقہ ہو تو منزل تک رسائی ہو ہی جاتی ہے، سو یہ وقت آ ہی گیا۔ میرے برادرِ نسبتی مولانا نور العلی قادری اور بھتیجے مولانا محمود غازی ان دنوں مصر میں زیرِ تعلیم ہیں، اس لیے قیام ورہائش کے انتظام میں قدرے آسانی ہوگئی۔ مصر میں اہلِ بیتِ اطہار اور صوفیہ کرام کے مزارات کے ساتھ عقیدت ومحبت کے جذبات قابلِ دید ہیں۔ شیخ ابراہیم دسوقی، امام بوصیری، سیدہ نفیسہ، سیدہ زینب اور امام حسین رضی اللہ عنہم کے مزارات بڑے ہی عالی شان بنائے گئے ہیں۔ لوگ کثرت کے ساتھ زیارت کے لیے آتے ہیں اور حسنِ عقیدت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

تیسرے دن جامع ازہر دیکھنے کے لیے نکلا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ شہرۂ آفاق ادارہ مسجد میں قائم ہوا تھا اسی لیے اسے جامع ازہر کہا جاتا تھا۔ قدیم طریقہ تعلیم کے مطابق مسجد کے صحن سے متصل دونوں جانب بڑے بڑے ہال تعمیر کیے گئے تھے، جہاں وقت کے ماہرین علوم وفنون درس دیا کرتے تھے۔ میں نماز عصر کے بعد مسجد میں داخل ہوا تھا۔ ویسے تو جامع ازہر کی وسعت کے پیش نظر کئی عمارتیں شہر کے مختلف علاقوں میں تعمیر کردی گئی ہیں

جہاں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہے، لیکن علمائے مصر نے وہ قدیم طریقہ تدریس آج بھی زندہ رکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑے ہال میں مصری عالم دین کرسی پر بیٹھے طلاق اور عدت کے احکام کی تشریح کر رہے ہیں اور سامنے طلبہ بیٹھے ہوئے ہمہ تن گوش ہیں، جب کہ پچھلے حصے پر چند پردہ نشیں خواتین بھی استفادہ کر رہی ہیں۔ احباب نے بتایا کہ ان کے درس میں شرکت کے لیے نہ کسی داخلہ فارم کے پر کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی طرح کی کوئی فیس ادا کرنے کی ہدایت۔ تشنگانِ علوم وحکمت کے لیے دعوتِ عام ہے، وہ جب چاہیں چشمہ ساقی پر ٹوٹ پڑیں اور اپنی پیاس بجھالیں۔

ویسے تو میں نے زمانہ طالب علمی کے چند سال لیبیا میں گزارے ہیں اور وہاں عام طور پر بولی جانے والی زبان سے بھی واقف ہوں، لیکن میرا خیال تھا کہ مصر جو علم وآگہی کا مرکز رہا ہے، وہاں کم از کم عربی زبان کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی نہ ہوگی۔ ہائے افسوس کہ مصر کے حالیہ سفر کے بعد یہ خوش فہمی بھی سراب ثابت ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ لوگ ایسی زبان میں گفت گو کر رہے ہیں جسے کم از کم "عربی زبان" کا نام دینا سراسر ناانصافی ہوگی، ہاں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ زبان عربی حروف تہجی پر ہی مشتمل ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ عربی صرف ونحو کی رعایت تو در کنار، سرے سے عربی الفاظ تک کو لوگوں نے اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال دیا ہے۔ سوچتا ہوں تو دماغ پھٹنے لگتا ہے کہ وہ عربی زبان جسے قرآن و حدیث کی زبان ہونے کا شرف حاصل ہوا، اسے آخر کیوں کر پس پشت ڈال دیا گیا ہے؟ اس حقیقت کو تو غیروں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ عربی زبان اپنی وسعت کے لحاظ سے دنیا کی بڑی ہی زرخیز زبان ہے۔ ایک ہی چیز کی تعبیر کے لیے کئی کئی الفاظ کا وجود کوئی معمولی بات نہیں؟ بہت ممکن ہے کہ عالم عرب میں بولی جانے والی مروّجہ زبان کو کچھ لوگ "عربی لہجات" سے موسوم کردیں، لیکن میرے خیال میں ان مضحکہ خیز لہجات پر عربی زبان کا اطلاق ہی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مثال سنتے چلیں۔ لیبیا میں لوگ جب یہ پوچھنا چاہتے کہ آپ کے بچے کتنے ہیں تو کہتے ہیں "غداش بم بنیو"؟ اب ذرا نحو وصرف کے قواعد وضوابط ایک طرف رکھیے اور دوسری جانب عربی زبان کی امہات لغات، پھر ہو سکے تو سراغ لگائیے کہ

اسے عربی زبان وادب کے کس خانے میں رکھا جائے؟ اسی طرح عام طور پر لوگ نفی میں جواب دینے کے لیے "مش" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہی کچھ میں نے مصر میں بھی دیکھا۔ تقریباً یہی حال الجزائر، تیونس، شام اور سعودی عرب کا بھی ہے۔ ان ممالک کی مروّجہ زبانوں کی حقیقتوں کا سراغ لگائیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ماضی میں مغربی ممالک کے زیر تسلط رہنے کی وجہ سے نہ صرف یہاں کی تہذیب وتمدن متاثر ہوئی ہے، بل کہ زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ لیبیا چوں کہ اٹلی کے زیر تسلط رہا ہے اس لیے وہاں کی زبان میں اطالوی کلمات داخل ہوگئے ہیں۔ اسی طرح الجزائر کی زبان میں فرانسیسی تعبیرات داخل ہوگئی ہیں۔

یہ کتنی تکلیف دہ بات ہے کہ وہ زبان جس پر عربوں کو فخر ہے، وہ خود ہی اپنے ہاتھوں اپنی وجہ تفاخر کا ہر دن خون کرتے ہیں اور انھیں اس بات کا ذرا احساس تک نہیں ہوتا! کیا یہ خون کے آنسو رونے کا موقع نہیں کہ ایک عام شہری تو بہرحال عام شہری سہی اساتذۂ فن بھی اپنی پرکشش زبان کے حسن وجمال کے تحفظ کی کوشش نہ کریں؟ میں نے جامع ازہر کے آنگن میں منعقد ہونے والے حلقہ درس کا تذکرہ کیا تھا۔ ویسے تو فصیح زبان میں ہی شیخ درس دے رہے تھے، لیکن ان کے منہ سے گاہے بگاہے ایسے کلمات نکل ہی پڑتے تھے کہ جس سے یہ سراغ لگانا مشکل نہ تھا کہ شیخ عام طور پر اپنے گھر میں مروّجہ لہجہ ہی بولتے ہوں گے۔ مجھے تو بعض احباب نے یہاں تک بتایا کہ بعض اساتذہ دورانِ تدریس بھی مروّجہ لہجے میں ہی گفت گو کرتے ہیں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ ایک ہفتے قیام کے دوران عام مصریوں میں صرف ایک ڈرائیور مجھے ایسا ملا جو میری گفت گو کا جواب فصیح عربی میں دے رہا تھا اور میں لطف لے لے کر سارے راستے اس سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتا رہا۔

صاحبو! بہت ممکن ہے کہ کوئی یہ کہہ دے کہ زبان عربی کو قواعد وضوابط کے لحاظ کے ساتھ بولنا چوں کہ قدرے دشوار ہے، اس لیے انسانی فطرت نے اسے سہل بناتے ہوئے لہجات میں ڈھال دیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ عربی زبان کے حسین وجمیل چہرے کی تباہی کے حوالے سے یہ توجیہ ذرا بھر قابلِ اعتنا نہیں۔ ذرا غور کریں کہ چینی زبان سے بھی زیادہ

دُنیا کی کوئی اور زبان دشوار ہوگی؟ چینی زبان کی دشواری کے اظہار کے لیے لوگ کہتے ہیں کہ چینی زبان بولنے کے لیے چین کی سرزمین پر دوبارہ پیدا ہونا پڑے گا۔ آخر اتنی سخت ترین زبان کو وہاں کے لوگ جب آسانی سے بول سکتے ہیں تو پھر فصیح عربی زبان بولنے والی ماں کی گود میں پروان چڑھنے والا بچہ کیوں کر فصیح عربی میں کلام نہیں کرسکتا؟ بات دراصل طبیعت کی سہل پسندی کی نہیں ہے، بل کہ عدم توجہی کی ہے۔ کاش! اہلِ عرب اپنی زبان کی عظمت ورفعت اور دنیا کی دوسری معلوم زبانوں پر تفوق وبرتری کی قیمت کا احساس کرتے تو آج سارے عالم عرب کی تنہا وہی زبان متداول ہوتی جو نزولِ قرآن کی زبان ہے۔

عام طور پر ہم علمی، سیاسی اور معاشی محاذوں پر اپنی جملہ ناکامی کا سارا الزام غیروں کے سر ڈال دیتے ہیں، لیکن سوچیے تو سہی کہ زبانِ عربی کے زلفِ ناز کی ابتری کے لیے ہم کسے موردِ الزام ٹھہرائیں گے؟ سننے کی ہمت ہے تو کہہ دوں کہ عربی زبان کے حسن وجمال کو دھندلا کرنے کے لیے اہل عرب خود ہی ذمہ دار ہیں۔ ٹھیک ہے مان لیا کہ عالم عرب پر غیروں کے تصرف سے عربی زبان متاثر ہوئی ہے، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ عالم عرب کو آزاد ہوئے تقریباً نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اگر غیروں کی وجہ سے عربی زبان متاثر ہوئی تھی تو ان کے جانے کے بعد اگر اس جانب سنجیدہ توجہ دی گئی ہوتی تو حالات خاصے مختلف ہوتے۔ یقین جانیے اب بھی موقع ہے کہ اہلِ عرب اپنی خوب صورت زبان کی طرف توجہ دیں اور کوئی ایسی تحریک شروع کریں کہ جس کے اثرات سے ہم سب کا مشترکہ دینی سرمایہ جس زبان وادب میں ہے اس کے تحفظ کو یقینی بنایا جاسکے۔

مغربی معاونت سے لیبیا کی تباہی کس کے مفاد میں؟

کہ آنے والے دور میں ممکن ہے کہ حکومت تو عوام کے مفاد میں ہو،
لیکن اس کا ملکی مفاد میں ہونا بہ ہر حال مشکوک ہے

تیونس میں صدر زین العابدین بن علی کی آمرانہ حکومت کے خاتمے کے بعد جن عرب ممالک میں عوامی غم وغصہ کی آگ بڑے پیمانے پر بھڑک اٹھی ان میں لیبیا بھی ہے۔ لیبیا کا دوسرا بڑا شہر بنغازی کسی قابل ذکر مزاحمت کے بغیر ہی معمر القذافی کے جابرانہ تسلط سے آزاد ہوگیا، لیکن یہی شعلہ جب احتجاج کی شکل میں طرابلس کے گرین اسکوائر نامی میدان تک پہنچا تو اسے حکومت کی سربراہی میں اسلحے کے زور سے کچل دیا گیا۔ اس عوامی احتجاج کو اگر حکمت ودانش مندی کے ساتھ پرامن طریقے سے ختم کر دیا جاتا تو شاید مغربی طاقتوں کو لیبیا پر مسلح فوج کشی کا بہانہ نہ ملتا، لیکن اسے کیا کہیے کہ نہ صرف اسے حکومت کی سرپرستی میں بے دردی کے ساتھ کچلا گیا تھا بل کہ اس فوجی کارروائی کا اعتراف بھی یہ کہتے ہوئے کیا گیا کہ یہ لوگ ''دہشت گرد'' ہیں۔ اب کیا تھا دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ معمر القذافی کی حکومت اپنی عوام پر کھلے عام ظلم وتشدد کر رہی ہے، لہٰذا لیبیا کے عوام کی دست گیری کرنا ہم سبھوں کا اخلاقی فریضہ ہے اور پھر نیٹو ممالک کی تحریک پر یواین او میں لیبیا کی عوام کی حمایت میں قرارداد پیش کر دی گئی۔ اس قرارداد کے مطابق ممبر ممالک کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ لیبیا کی عوام کو حکومت کی سرپرستی میں ہونے والے مظالم سے بچانے کے لیے ضرورت کے پیش نظر طاقت کا استعمال کریں۔ اب کیا تھا اس آڑ میں مغربی ممالک نے ایک پس پردہ منصوبہ بند سازش کے تحت باقاعدہ فوج کشی کر دی۔ اس پورے چھ سال ماہ کے دوران کئی مواقع ایسے آئے جب دنیا کی انصاف پسند تنظیموں نے نیٹو کی سرپرستی میں ہونے والے اقدامات پر کھلے عام تنقیدیں کیں اور آواز سے آواز ملا کر بہ بانگ دہل کہا کہ اس طرح کی وارداتیں

یواین او کی طرف سے طے شدہ حدوں کی کھلی خلاف ورزی ہے، لیکن اسے سنتا کون ہے کہ وہی پرانی مثل آج بھی من وعن صادق آتی ہے کہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس''۔

لیبیا پر فوج کشی کی ابتدا یعنی ۱۵؍فروری ۲۰۱۱ء سے لے کر معمر القذافی کی ہلاکت کی تاریخ ۲۰؍اکتوبر ۲۰۱۱ء تک کے درمیان لیبیا کی تباہی وبربادی کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ کس درجے کا ملی نقصان ہوا ہے۔ ایک محدود اندازے کے مطابق ہزاروں جانیں تلف ہوئیں، لاکھوں ذاتی مکانات منہدم ہو گئے، اہم سرکاری عمارتیں تہ وبالا کر دی گئیں، ملک کا دفاعی نظام سرے سے ختم کر دیا گیا، سڑکیں تباہ کر دی گئیں، تیل نکالنے کے نظام مفلوج کر دیے گئے، کئی شہروں کے ہاسپٹل جزوی طور پر حملے کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے، مساجد اور اسکولوں کو بھی اچھا خاصا نقصان پہنچا......اور اس دوران لوگ جس درد وکرب، تکالیف و مشکلات اور مصائب وآلام کے دور سے گزرے وہ اس پر مستزاد ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد نتیجے کے اعتبار سے فائدے میں کون رہے گا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ کرنل معمر القذافی کی حکومت جبر واستبداد، ظلم وستم اور بربریت وتشدد کی دنیا میں بد ترین مثال کہی جاسکتی ہے۔ صرف شائبۂ شک کی بنیاد پر اپنے مخالفین کو بے دردی سے کچل دینا، حکومت پر تنقید کرنے والوں کا نام ونشان دنیا سے مٹا دینا اور خوف وہراس کا وہ گھٹن زدہ ماحول پیدا کرنا کہ جس کے تصور ہی سے انسان کی روح کانپ جائے، کرنل قذافی کی حکومت کا وہ سیاہ باب ہے جسے ہزار کوششوں کے باوجود پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا۔ اہل وطن شاید میری اس بات سے متفق نہ ہوں، لیکن یہ بہ ہر حال مشاہدۂ حقیقت ہے کہ ہم جب تعلیم کے مقصد سے لیبیا گئے اور وہاں لوگوں کو ڈرے، سہمے اور دہشت وخوف کے مارے لرزتے ہوئے پایا تو میری زبان یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکی کہ ہندوستان کی سرزمین پر حکومت کی طرف سے ہزار حق تلفیوں، ناانصافیوں اور ظلم وستم کے باوجود مسلمانوں کو جس طرح کی آزاد فضا حاصل ہے، لیبیا کے ستم زدہ ماحول سے اس کا کوئی مقابلہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔

بہ ہر کیف میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ معمر القذافی کی حکومت نہایت ہی جابرانہ اور ظالمانہ رہی ہے۔ انھوں نے اپنی عوام کی فلاح وبہبودی کے لیے بھی خاطر خواہ

اقدامات نہیں کیے اور نہ ملک ہی کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق تعلیم، صنعت و حرفت اور ٹکنالوجی کے میدان میں مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی موجودگی سے نہ ہی پورے طور پر عوام کا بھلا ہوا اور نہ ہی ملک کا۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں تیل پیدا کرنے والے ممالک کی فہرست میں لیبیا کا مقام آٹھواں ہے جب کہ ملک کے لق و دق رقبہ کے اعتبار سے آبادی نہایت ہی قلیل۔ اس طرح فی کس آمدنی کے حساب سے لیبیا دنیا کے رئیس ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ چاہتے تو اپنے ملک کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق ترقی کے اوجِ ثریا پر پہنچا سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

اب ذرا دوسری طرف نگاہ ڈالیے کہ موجودہ عسکری مزاحمت کے نتیجے میں جو طبقہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے تیار ہے کیا یہ ملکی مفاد میں ہے؟ حالات و قرائن اور تاریخی حقائق بتاتے ہیں کہ مغربی ممالک جب بھی کسی کے خلاف لشکر کشی کرتے ہیں تو مظلوموں کی دادرسی اور بے سہاروں کی نصرت و حمایت کے پرشکوہ نعرے بہ ظاہر زبان پر ہوتے ہیں، لیکن درپردہ طویل المدت ملکی مفاد پیش نگاہ ضرور ہوتا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال عراق ہے۔ عراق کی بربادی کے بعد مغربی طاقتوں نے عراق کی کٹھ پتلی حکومت کے ساتھ اپنے مفاد کے مطابق اقتصادی و معاشی معاہدہ کر رکھے ہیں اور ملک کی ساری دولت مسلسل غیروں کے ہاتھوں میں جارہی ہے۔ اس طرح بلا شبہہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ماضی میں اس طرح ملک غلام بنائے جاتے تھے کہ انگریز خود وہاں جاکر ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے، اور اب عہد جدید میں انھوں نے خود وہاں جانے کی زحمت سے بھی اپنے آپ کو بچالیا ہے اور اسی ملک کی پسندیدہ شخصیت کو اپنا نمائندہ بنا کر اپنا تسلط قائم رکھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ خدشہ ہے کہ لیبیا میں بھی مغربی طاقتوں کی کوئی کٹھ پتلی حکومت قائم کردی جائے اور تیل سے مالا مال اس ملک کی دولت بھی غیروں کے ہاتھوں میں چلی جائے۔

یہ قرینِ قیاس ہے کہ تباہ حال لیبیا کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے کرنے کے بہانے نہایت ہی مہنگے معاہدے ان کے ساتھ کیے جائیں گے جنھوں نے قذافی حکومت کے خاتمے کے لیے تعاون کیا ہے، لیبیا کی فوجی تربیت، اسلحہ اور ساز و سامان کے لیے بھی سبز

باغ دکھا کر ایک کی جگہ دس خرچ کروایا جائے گا، سستے داموں تیل کی فراہمی کے معاہدے کروائے جائیں گے اور پھر تیل کی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ بھی لشکر کشی میں ہوئے اخراجات کے نام پر آہستہ آہستہ لیا جاتا رہے گا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ قذافی کے قتل کے بعد امریکی صدر نے جو بیان دیا ہے اس میں اس طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے لیبیا کو قذافی حکومت کے آہنی پنجے سے نجات دلانے میں امریکہ کا بھی حصہ ہے، حالاں کہ دنیا جانتی ہے کہ ابتدائی لشکر کشی میں جب امریکہ پیش پیش تھا اور داخلی طور پر انھیں اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا تو انھوں نے اپنے آپ کو اس تحریک سے دور کرلیا تھا۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ لیبیا کی دولت میں حصے بخرے کرنے کا جب وقت آگیا تو یہ جتایا جارہا ہے کہ ہم نے بھی تم پر احسان کیا ہے تاکہ امریکہ کی ڈوبتی ہوئی اقتصادی کشتی کو لیبیا کے قیمتی تیل کے سہارے بچایا جاسکے۔

صاحبو! معمر القذافی کی حکومت اور اس کے خاتمے کے بعد جس قسم کی حکومت بننے کی توقع ہے اس کے درمیان بہ ظاہر بہت زیادہ فرق دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ سابقہ حکومت نہ عوام کے مفاد میں تھی اور نہ ہی ملکی مفاد میں، جب کہ آنے والے دور میں ممکن ہے کہ حکومت تو عوام کے مفاد میں ہو، لیکن اس کا ملکی مفاد میں ہونا بہر حال مشکوک ہے۔ عوامی مفاد اور ملکی مفاد ویسے تو ایک ہی سکے کے دو رُخ سمجھے جاتے ہیں، لیکن یہاں اس تقسیم سے میری مراد یہ ہے کہ شخصی آزادی، عدل و انصاف اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی کو عوامی مفاد کے خانے میں رکھا جائے جب کہ قومی دولت، ملی اثاثہ اور اجتماعی وقار کو ملکی مفاد کے خانے میں رکھا جائے۔

بہر کیف خدشات جیسے بھی کیوں نہ ہوں، ہم سبھوں کو دعا کرنی چاہیے کہ اتنی عظیم تباہی و بربادی کے بعد اللہ تعالیٰ لیبیا کے مسلمانوں پر رحم و کرم کی چادر دراز فرمائے اور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں زمامِ اقتدار سپرد ہو جو اپنے ہم وطنوں سے بھی محبت کرتے ہوں اور اپنے ملک سے بھی ...... جن کے دل انسانیت کی قدر و منزلت سے آشنا ہوں ...... جو بے کسوں کا سہارا بنیں ...... مظلوموں کی دادرسی کریں ...... حقوق اللہ کی تکمیل کا جذبہ مسلمانوں میں بیدار کریں اور حقوق العباد کے حوالے سے ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہیں۔

یمن کے صدارتی منصب پر صرف چہرہ تبدیل یا حالات بھی؟

برس ہا برس سے اقتدار پر قبضہ کیے رہنے کے بعد جانے والے
کم از کم حقیقی تبدیلی کی راہ کشادہ کر جائیں!

یمن میں بالآخر ۲۷ر فروری ۲۰۱۲ء کو سابق صدر علی عبداللہ صالح کے ۳۴ سالہ اقتدار کا علامتی طور پر خاتمہ ہو گیا۔ متحدہ یمن کے منصبِ صدارت پر فائز ہونے سے قبل علی عبداللہ صالح ۱۷ر جولائی ۱۹۷۸ء کو شمالی یمن کے صدر بنے۔ ان کا تعلق یمن کے الاحمر قبیلہ سے بتایا جاتا ہے جو کہ زیدی شیعہ فرقہ کی حیثیت سے مشہور ہے۔ تعلیم پرائمری درجے تک حاصل کی، لیکن فوجی تربیت حاصل کرتے ہوئے وہ بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہوئے ملک کے صدر بن گئے۔ ۱۹۹۰ء کے بعد جب یمن کے دونوں حصے متحد ہو گئے تو معاہدے کے مطابق علی عبداللہ صالح کو متحدہ یمن کا صدر بنایا گیا اور جنوبی یمن کے صدر علی سالم البید کو نائب صدارت کا منصب تفویض کیا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک نام نہاد ریفرنڈم کے ذریعہ وہ مسلسل اقتدار پر قابض تھے۔

پچھلے سال تیونس، مصر اور لیبیا میں ہونے والے عوامی احتجاجات سے حوصلہ پا کر یہاں کے لوگوں نے بھی برس ہا برس سے ہونے والے ظلم و تشدد، جبر و قہر اور بے جا سختیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔ ابتدا میں تو اسے ملک کے خلاف سازش کہہ کر طاقت کے زور پر کچلنے کی کوشش کی گئی، لیکن جب پر امن احتجاج کا سلسلہ دراز ہوتا ہوا محسوس ہوا تو صدارتی محل سے ایسے بیانات دیے گئے کہ جس سے عوامی غم و غصہ کو کسی حد تک کم کیا جا سکے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو شاید یہ دنیا کے پہلے صدر ہوں گے جس نے بار بار

اقتدار کی منتقلی کا وعدہ کیا ہو اور پھر سیاسی پینترا دکھا کر اسے سرد خانے میں ڈال دیا ہو۔ کبھی تو وہ کہتے کہ مجھے خلیجی ممالک کے ذریعہ پیش کی ہوئی قرارداد منظور ہے اور وہ جلد ہی اس پر دستخط بھی کر دیں گے، پھر کبھی کہتے کہ وہ اقتدار ملک میں شورش بپا کرنے والے عناصر کے حوالے نہیں کریں گے۔ بہ ہر کیف کچھ دنوں پہلے کیا ہوا اپنا وعدہ بالآخر انھوں نے پورا کیا اور منصبِ صدارت پر چہرہ تبدیل ہو گیا۔

اسے کیا کہیے کہ سال بھر کی جد و جہد کے بعد علی عبداللہ صالح نے اپنا اقتدار چھوڑا بھی تو ان ہی کے نائب کے ہاتھوں چلا گیا۔ اب ظاہر ہے کہ نظام بھی وہی ہے، افراد بھی وہی پرانے اور پھر اپنے پرانے باس کی موجودگی بھی تو کیا یمن میں کسی انقلابی تبدیلی کی توقع کی جا سکتی ہے؟ یہ خیال رہے کہ نئے ہونے والے صدر عبد ربہ ہادی پہلے ہی سے علی عبداللہ صالح کے نائب رہ چکے ہیں۔ یہ منصب انھیں ۳ر اکتوبر ۱۹۹۴ء میں اس وقت ملا جب متحدہ یمن کے نائب صدر علی سالم البید نے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا تھا۔ اس طرح کم و بیش تقریباً ۱۸ر سالوں سے وہ نائب صدارت کے منصب پر فائز ہیں۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ اس طویل عرصے میں اپنے سابق باس کے زیر سایہ رہتے ہوئے انھوں نے عوام کے مفاد کو نظر انداز کرتے ہوئے اقتدار سے چپکے رہنے کا گر ضرور سیکھ لیا ہوگا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی پیش نگاہ رہے کہ ایک طویل عرصے تک یمن پر انگریزوں کا قبضہ رہا ہے۔ اسی دوران ۱۹۶۰ء میں عبد ربہ ہادی عسکری تربیت کے لیے برطانیہ گئے تھے جہاں ان کا قیام چند ماہ تک رہا۔ اور پھر جب انگریزوں کے چنگل سے یمن آزاد ہو گیا تو اربابِ اقتدار نے اپنے تحفظ و بقا کے پیش نظر اس وقت دنیا کی دوسری بڑی طاقت سوویت یونین سے مراسم بڑھا لیے، بل کہ یہ کہنا حقیقت کی صحیح ترجمانی ہوگی کہ اس دور میں یمن کو بھی سوویت یونین کے دوست ممالک کی صف میں دیکھا جاتا تھا۔ سوویت یونین سے قربت کے زمانے میں ایک مرتبہ پھر عسکری تربیت کے لیے عبد ربہ ہادی چار سالوں کے لیے روس گئے۔

جناب عبد ربہ ہادی کا انگریزوں کے تسلط کے زمانے میں فوجی تربیت کے لیے برطانیہ اور سوویت یونین سے قربت کے زمانے میں روس جانا کوئی ایسی بات نہیں جسے محض

اتفاق کہا جائے۔ جو لوگ بڑی طاقتوں کے سیاسی پیچ وخم سے واقف ہیں ان پر یہ امر پوشیدہ نہیں کہ جب یہ طاقتیں کسی کو اپنی ''مہمانی کا شرف'' عطا کرتی ہیں تو اس ظاہری مقصد کے پس پردہ اپنا ذاتی مفاد بھی پوشیدہ رکھتی ہیں، بل کہ سچی بات یہ ہے کہ اپنے ذاتی مفاد کے حصول کے لیے ہی مہمان نوازی جیسے ''خوب صورت بہانے'' ڈھونڈے جاتے ہیں۔ اس حقیقت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبدربہ ہادی منصب صدارت پر فائز ہونے سے پہلے بھی مغرب کے محبوب نظر تھے اور عہدۂ صدارت کا حلف لینے کے بعد جس انداز میں انھیں مغرب نے مبارک بادیاں دی ہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اب بھی ان کی پسندیدہ شخصیت ہیں۔ اس لیے یہ بہت ممکن ہے کہ جس طرح علی عبداللہ صالح کے دورِ حکومت میں بیرونی مفادات کی چوکھٹ پر عوامی خواہشات کو قربان کیا جاتا رہا ہے، وہ بعینہٖ اب بھی کیا جاتا رہے کہ محکمہ صدارت کی کرسی پر ایک دوست کے جانے کے بعد دوسرے دوست کی آمد سے صرف چہرہ بدلتا ہے، پالیسی نہیں بدلتی۔

یمن سے بیرونی ممالک کے مفادات کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے وکی لیکس کا وہ انکشاف پڑھیے جو منظر عام پر آ چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ گذشتہ سال جب یمن کی سرزمین پر حالات دگرگوں ہونے لگے تو خود علی عبداللہ صالح کی پارٹی کے ایک مشہور و معروف لیڈر حامد الاحمر نے ۷؍اپریل ۲۰۱۱ء کو کیبل کے ذریعہ امریکی محکمہ خارجہ کو یہ یقین دلایا کہ وہ علی عبد اللہ صالح کے خلاف پورے ملک میں احتجاجات اور مظاہرے منظم کریں گے۔ واضح رہے کہ حامد الاحمر کا بھی تعلق اسی قبیلے سے ہے جس سے علی عبداللہ صالح کا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جب ایسا محسوس ہونے لگا کہ علی عبداللہ صالح کی حکومت ختم ہو جائے گی تو اسی پارٹی کے ایک دوسرے سیاسی لیڈر سے پینگیں بڑھائی جا رہی ہیں تا کہ اپنا مفاد کسی حال میں متاثر نہ ہونے پائے۔

صاحبو! بہ ہر کیف فروری ۲۰۱۱ء میں شروع ہونے والے احتجاج کے نتیجے میں عرب کے ایک اور ملک میں سیاسی منظر نامہ تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ان سارے ممالک کے لیے درسِ عبرت کا سامان فراہم کر رہی ہے جہاں لمبے عرصے سے لوگ کرسیِ اقتدار کے

ساتھ چپکے ہوئے ہیں اور ''بادشاہت''، ''ریفرینڈم'' اور ''قائد'' جیسی خستہ حال چادر کی اوٹ میں محوِ خواب ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ نیند سے بیدار ہوں اور عصر حاضر کے تقاضوں کو پڑھنے کی کوشش کریں جو اب کتابوں میں نہیں، بل کہ نوشتۂ دیوار کی منزل تک پہنچ چکا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ پہلے اپنے اقتدار کے خلاف چند افراد ہی کو خطرہ سمجھتے ہوں، لیکن اب فیس بک، میڈیا اور انٹرنیٹ کے سہارے منٹوں میں ملک کے کونے کونے تک بے چینی و اضطراب کی لہر پھیل جاتی ہے اور لوگ سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ چند سال قبل تک عوامی شورش و بے چینی کو آسانی کے ساتھ دبایا جا سکتا تھا، مگر موجودہ ترقی یافتہ دُنیا میں اب یہ ممکن نہیں رہا۔ چلتے چلتے کہہ دوں کہ کیا یہ بہتر نہیں کہ برس ہا برس سے ملک کے خزانوں پر قابض رہتے ہوئے عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے بعد جانے والوں میں کم از کم اتنی غیرت تو جاگ جائے کہ وہ ملک میں ایسی کار آمد تبدیلی کی راہ کشادہ کر دیں جس کے ذریعہ ایسے لوگ برسرِ اقتدار آئیں جو واقعی ملک کے ہمدرد ہوں، ملک کی دولت کو عوام کی دولت سمجھیں اور ملک کی عزت کو عوام کے وقار میں ہی مضمر سمجھیں اور عدل وانصاف کے اس پیمانے پر عمل کو یقینی بنائیں جو ہمارے مذہب کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

تیونس اور لیبیا میں اِسلامی ضابطۂ حیات کے نفاذ کا اِعلان

اظہارِ مسرت کا موقع ضرور ہے، مگر احتیاط کے ساتھ

تقریباً آٹھ ماہ تک مسلح جدوجہد کے بعد باغیوں نے لیبیا پر مکمل قبضہ کرلیا ہے اور سرکاری طور پر جنگ کے خاتمے کا اعلان بھی ہوچکا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے طرابلس کے بڑے شہر بنغازی میں ایک بڑی ہی پرشکوہ تقریب بہ نام ''جشنِ فتح'' منائی گئی، جس میں نیشنل ٹرانزیشنل کاؤنسل کے صدر مصطفیٰ عبدالجلیل نے اعلان کیا کہ ملک کا قانون شریعتِ اِسلامیہ کے مطابق ہوگا۔ اسی طرح تیونس میں بھی انتخاب کے نتیجے میں برسرِ اقتدار آنے والی اسلامی نظریات کی حامل پارٹی سے بھی یہی توقع رکھی جارہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں ملکوں کے حوالے سے متذکرہ بالا خبر ہم سبھوں کے لیے باعث خوشی ہے، لیکن اس اعلان کے نتیجے میں یہ سمجھ لینا کہ ان دونوں ملکوں میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہوچکا ہے' قبل از وقت ہوگا۔

سیاسی نشیب و فراز پر عقابی نگاہ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس طرح کے اعلانات زیادہ تر ہم وطنوں کو خوش کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب معمر القذافی نے بیالیس سال قبل لیبیا سے بادشاہت کا خاتمہ کیا تھا تو عوام نے ملکی سطح پر ان کا خیر مقدم کیا اور کھلے دل سے ان کی پزیرائی کی تھی کیوں کہ انھوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اب بادشاہت کے خاتمے کے بعد ملک کا اقتدار عوام کے ہاتھوں میں ہوگا۔ وہ پوری آزادی، عزت اور وقار کے ساتھ یہاں زندگی گزار سکیں گے۔ ملکی آمدنی کسی ایک فرد کی ملکیت نہیں ہوگی بل کہ اس میں ہر فرد کا حصہ ہوگا۔ اس طرح کے بلند بانگ دعووں کے

سایے میں انھوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنالی۔ یہ اور بات کہ دھیرے دھیرے انھوں نے اقتدار پر اپنا شکنجہ مضبوط کیا اور اپنے دعووں کو پس پشت ڈال دیا۔

اسی طرح تیونس کے صدر زین العابدین بن علی نے کیا۔ جب انھوں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو عوام نے بھی ان سے بڑی ہی امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں۔ وہ دل سے ان کی قدر کرتے تھے اور ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جان دینے کے لیے بھی تیار رہتے تھے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ملک کے خزانہ کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ اپنے مخالفین کی آواز کو بے دردی کے ساتھ کچلا اور جبر و استبداد کے ساتھ ایک طویل عرصے تک ملک پر قابض رہے۔ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ ثابت کرتے رہے کہ وہ عوام کے ذریعہ منتخب کیے ہوئے صدر ہیں۔

ان دونوں ممالک میں ''اسلامی شریعت'' کے نفاذ کا اعلان بلاشبہ قابل مسرت ہے، لیکن ماضی کے تلخ تجربات کی بنیاد پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ ابھی سے کوئی حتمی رائے نہ قائم کرلی جائے۔ آنے والے چند مہینے اس حوالے سے نہایت اہم ہیں۔ اس دوران ہوا کے رخ کی بنیاد پر مطلع اچھی طرح صاف ہوجائے گا کہ ملک کا نشانہ کیا ہے۔ یہ بات مَیں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ لیبیا کے موجودہ انقلاب میں جس طبقے نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، ان میں بڑی تعداد میں لوگ چہرے پر داڑھی سجائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لٰہذا یہ بہت ممکن ہے کہ اس طبقے کے جذبات کے پیش نظر مصطفیٰ عبدالجلیل نے اسلامی شریعت کے نفاذ کا وعدہ کرلیا ہو تاکہ اس اعلان کی آڑ میں ان مذہبی جذبات کی تپش کو کم کیا جاسکے اور ساتھ ہی ساتھ انھیں غیر مسلح کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہوجائے۔

یہ احتیاط اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان دونوں ممالک کو ابھی سے ''خود مختار اور آزاد'' سمجھنا دانش مندی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ماضی کی جابرانہ حکومتوں کا خاتمہ ہوگیا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اسے عدل و انصاف، اخوت و بھائی چارگی اور انسانیت کے عزت و وقار کا دور بھی سمجھ لیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب حکومتیں کمزور ہوتی ہیں تو مغربی طاقتیں آنسو پونچھنے کے بہانے دستِ تعاون دراز کرتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ وہاں کے سیاسی معاملات میں

پورے طور سے دخیل ہو جاتی ہیں۔ فوجی جنرل خریدے جاتے ہیں، انھیں کرسی کا حریص بنایا جاتا ہے اور پھر اپنی من پسند پالیسی بنا دی جاتی ہے۔ اس طرح انقلاب کے نتیجے میں ہوتا یہ ہے کہ پہلے ملک اپنے ہم وطنوں کے قبضہ میں تھا اور اب غیروں کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۹۱ء میں الجزائر کے صدر شاذلی بن جدید کی نگرانی میں آزادانہ انتخاب ہوئے۔ علی بلحاج اور عباس مدنی کی قیادت میں اسلامک سالویشن فرنٹ نامی اسلامی نظریات کی حامل پارٹی نے بھی انتخاب میں حصہ لیا۔ اعلان کے مطابق دو مرحلوں میں انتخاب ہونا تھا۔ پہلے مرحلے کے انتخاب کے نتیجے میں اسلامک سالویشن فرنٹ کو زبردست کام یابی ملی۔ یہ ایسی فقید المثال کام یابی تھی کہ دوسرے مرحلے کے انتخاب کی حیثیت رسمی سی رہ گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بی بی سی لندن کی عربی سروس کے نیوز ریڈر نے اس کام یابی پر قرآن کریم کی آیت سے ایک محاورہ مستعار لیتے ہوئے کہا تھا ''قاب قوسین او ادنی من الحکومۃ'' یعنی اسلامک سالویشن پارٹی اب حکومت کے اس قدر قریب ہوگئی جیسے دو کمانوں کی دوری ہوا کرتی ہے، بل کہ اس سے بھی کم۔ اسلام پسند جماعت کی یہ کام یابی غیروں کے حلق سے اتر نہ سکی اور مغربی ممالک نے کھل کر اور عرب ممالک نے درپردہ اسے ناکام بنانے کی مہم شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صدر شاذلی بن جدید پر دوسرے مرحلے کے الیکشن کو منسوخ کرنے کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ چوں کہ بہ حیثیت صدر وہ الیکشن کا اعلان کر چکے تھے اور اسے بہ ظاہر منسوخ کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہ تھی، اس لیے انھوں نے خود مستعفی ہونے ہی میں اپنے لیے بھلائی سمجھی اور انھوں نے اقتدار فوج کے حوالے کر دیا۔ فوج نے ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہی سب سے پہلے الیکشن کو غیر معینہ مدت کے لیے منسوخ کیا اور پھر اسلامک سالویشن فرنٹ کے دونوں رہ نماؤں کو قید کر لیا گیا۔ ان پر ملک میں افراتفری، دہشت گردی اور کشت و خون کے جھوٹے مقدمات قائم کیے گئے۔ اس طرح اسلامی نشاۃ ثانیہ کی جو ہلکی سی امید پیدا ہوئی تھی وہ بھی دم توڑ گئی۔

صاحبو! یہ ایک مثال ہے جس سے ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ غیروں کو یہ تو کسی قدر گوارا ہو جاتا ہے کہ کوئی ملک نام کا ''اسلامیہ جمہوریہ'' کہلائے، لیکن وہ یہ قطعی برداشت

نہیں کر سکتے کہ عملی اعتبار سے بھی وہ اسلامی فکر و تہذیب کا عکسِ جمیل بن جائے۔ لہٰذا جب بھی کسی اسلامی ملک میں اس طرح کی تحریکیں سر ابھارتی ہیں تو ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کبھی تو وہ اپنے پٹھو سربراہوں سے ایسی تحریکوں کو کچلوا دیتے ہیں اور کبھی مالی معاونت کے ذریعہ ہم درد بن کر اس قدر دخیل ہو جاتے ہیں کہ ان سے اپنی بات منوا لیتے ہیں۔ لیبیا میں عسکریت پسندوں کی مغربی حمایت کو اسی پالیسی کی دوسری شکل کے تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔ اور بہ ظاہر آثار بھی اسی کی چغلی کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ ۲۰۰۷ء سے لے کر ۲۰۱۱ء تک وزاتِ عدل و انصاف کے منصب جلیلہ پر فائز رہنے والے مصطفیٰ عبدالجلیل کو اب اسلام کیسے یاد آ گیا؟ اگر وہ واقعی اسلامی شریعت سے محبت کرنے والے ہوتے تو دورِ وزارت کے چار سالوں میں کبھی تو ان کے حوالے سے کوئی ایسا اشارہ سامنے آ جاتا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ اندر سے اسلام پسند ہیں۔ اس لیے یہ وقت اظہارِ فرحت و انبساط کا نہیں، بل کہ انگریزی کے مشہور مقولہ کے مطابق یہ وقت "Watch and See" کا ہے۔

کیا کسی مجرم کو سرِ عام قتل کی سزا دینا بربریت ہے؟

بند کمرے میں دی ہوئی سزا دوسروں کے لیے سامانِ عبرت نہیں بنتی

ابھی حال ہی میں بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے آٹھ سینہ مجرموں کو سعودی عرب میں سرعام قتل کر دیا گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے چوری کی واردات کے دوران ایک مصری شخص کو قتل کر دیا تھا، جس کی پاداش میں انھیں سر قلم کرنے کی سزا دی گئی ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس موقع پر بھی مغربی میڈیا نے اسے اچھالنا شروع کر دیا کہ اس طرح کی سزا سرعام دینا قدامت پسندی اور بربریت کی علامت ہے۔ اسے کیا کہیے کہ مغربی افکار سے مرعوبیت کے نتیجے میں ہمارے کچھ بھولے بھالے مسلمان بھی اپنے جذبات کا اظہار اسی قسم کے جملوں سے کرنے لگے ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ایک صاحب نے جمعہ کی نماز کے بعد مجھ سے پوچھ لیا کہ ابھی سعودی عرب کی انتظامیہ نے آٹھ بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو سرعام قتل کر دیا ہے۔ کیا یہ اقدام صحیح ہے؟ میں نے پوری سنجیدگی و متانت کے ساتھ انھیں سمجھاتے ہوئے کہا کہ آپ کے اس سوال کا تعلق تین جہتوں سے ہے۔ پہلی جہت تو یہ ہے کہ آیا سعودی عرب نے جو کچھ کیا وہ صحیح ہے یا غلط؟ دوسری جہت یہ ہے کہ سرعام قتل کرنے کا طریقہ فی نفسہٖ کیسا ہے؟ اور تیسری جہت یہ کہ اس طرح کے اقدام کا مقصد کیا ہے؟ میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سعودی عرب نے جو اقدام کیا ہے، اس حوالے سے میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ میں یہ معلوم کر سکوں کہ انھوں نے حق و انصاف کے سارے ضروری تقاضے پورے کر بھی لیے تھے یا نہیں؟ دوسری بات یہ کہ نفاذِ شریعت کے حوالے سے سعودی عرب میں دوہرا معیار اپنانے کے قصے، وقفے وقفے

سے خبروں میں آتے رہتے ہیں، یعنی دوسرے ملکوں سے روزگار کی تلاش میں آئے ہوئے مزدوروں پر وہ خود زیادتی کرتے رہتے ہیں اور جب مزدور اپنی زبان کھولنے کی کوششیں کرتے ہیں تو کوئی فرضی الزام لگا کر انھیں سزا دلوا دی جاتی ہے۔ لہٰذا ان کے اس اقدام کے صواب یا خطا ہونے کے حوالے سے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ سوال کی دوسری جہت کے حوالے سے میں نے کہا کہ وہ لوگ جو سرعام قتل کو بربریت قرار دیتے ہیں، وہ بھی تو سرعام ہی کارروائیاں کرتے ہیں۔ لڑاکا جہاز جب فضا کو چیرتے ہوئے کسی علاقے میں داخل ہوتا ہے تو کیا لوگ اسے نہیں دیکھتے؟ اور پھر جب وہ بم برسا کر واپس لوٹتے ہیں تو کیا لوگ تباہی و بربادی کی المناک تصویریں نہیں دیکھتے؟ اسی طرح بندوق کی گولی کے ذریعہ جب کسی کو نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو کیا اسے بر سرعام سزا دینا نہیں کہیں گے؟ اور یہ بھی پیش نگاہ رہے کہ اس طرح کے فضائی حملہ سے نہ صرف ممکنہ مجرم ہی کی جان لی جاتی ہے، بل کہ مکان میں رہنے والے ننھے ننھے شیر خوار بچے بھی سسک سسک کر دم توڑتے ہیں، گھر میں چین کی نیند سونے والے بچے بھی ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر دیتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ بے گناہ عورتیں بھی لقمہ اجل بن جاتی ہیں......اور اگر اہل خانہ میں سے کوئی بے گناہ زندہ بچ بھی جاتا ہے تو وہ مکان و اثاثہ کی تباہی و بربادی کے بعد در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ کہنا بجا ہوگا کہ مغربی طریقۂ سزا میں بسا اوقات صرف مجرم ہی کو سزا نہیں ملتی، بل کہ اس کے ساتھ ساتھ پورے خاندان پر مصائب و آلام کے بادل ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس موقع پر وہ مثال بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے جب لیبیا کے لیڈر معمر القذافی کے گھر پر امریکہ کے صدر ریگن کے حکم پر حملہ کیا گیا، جس کے نتیجے میں گود لی ہوئی ایک شیر خوار بچی جاں بحق ہو گئی۔ ذرا عقل کے ناخن لیں، اگر جرم تھا بھی تو معمر القذافی کا تھا نہ کہ اس معصوم بچی کا۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی مجرم کو سرعام قتل کرنے کی مذمت کرنے والے نام نہاد انسانیت کے خیر خواہ اس وقت اپنی زبان کیوں بند رکھتے ہیں جب محض شائبہ جرم کی بنیاد پر پوری آبادی تہ و بالا کر دی جاتی ہے؟

پھر میں نے گفت گو کا رُخ بدلتے ہوئے موصوف سے کہا کہ بر سرعام سزا دینے کی

ہدایات اسلامی شریعت میں نہایت ہی شرح وبسط کے ساتھ موجود ہیں، لہٰذا ہمیں بہ ہر حال اس کی پابندی کرنی ہے۔ اب اگر اس طرح کے اقدام کے پیچھے حکمت جاننے کا شوق ہو تو عرض کروں کہ اسلام کو اس بات سے دل چسپی نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سزا دی جائے، بل کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ کم سے کم لوگ سزا پائیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ممکنہ جرائم کے حوالے سے خوف و دہشت بٹھا دی جائے تا کہ اگر وہ کبھی بھولے سے بھی جرائم کا خیال حاشیۂ ذہن میں لائیں تو اقدام سے قبل ہی رونگٹے کھڑے کر دینے والے سزا کے خوف سے کانپ جائیں اور جرم سے باز رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قصاص قتل کی حکمت بتاتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَّأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔

(سورہ بقرہ، آیت:۱۷۹)

یعنی اے فہم و فراست رکھنے والو! قتل کے بدلے میں قتل کر دیے جانے کی سزا میں تمہارے لیے زندگی ہے تا کہ تم باز رہو۔

بہ ظاہر قتل کرنے والے کو بھی بہ طور سزا قتل کر دیا جاتا ہے، لہٰذا یہاں تو ایک اور زندگی کا چراغ بھی گل ہوتا ہوا نظر آتا ہے، پھر اسے ''زندگی'' کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟ علماے مفسرین کہتے ہیں کہ جب ایک مجرم کو قتل کے بدلے قتل کر دیا جائے تو دوسرے ممکنہ مجرمین انجام دیکھ کر خود اس طرح کے اقدام سے باز رہنے کی کوشش کرتے ہیں، یعنی قصاص کی صورت میں ایک مجرم قتل کر دیا جاتا ہے، لیکن وہ کئی دوسرے ممکنہ مقتول کی زندگی بچانے کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ قصاص قتل میں زندگی ہے۔ اب اگر کسی مجرم کو علیٰ رؤس الاشہاد قتل نہ کیا جائے تو دوسروں کو عبرت کیوں کر حاصل ہوگی؟ اسی لیے جو لوگ بند کمرے میں کسی مجرم کو بجلی کے کرنٹ کے ذریعہ موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں، وہ دوسرے مجرمین کو درسِ عبرت دینے میں سرے سے ناکام رہتے ہیں۔ ایسے تمام ممالک میں جرائم کی واردات پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات دو پہر کی دھوپ کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ سال میں کئی ایک مجرمین کو موت کی سزا دینے کے باوجود جرائم کی تعداد میں کوئی خاطر خواہ کمی واقع

نہیں ہو رہی ہے۔ دوسری طرف جن ممالک میں بر سر عام سزا دی جاتی ہے وہاں جرائم کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس طرح بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی شریعت کے مطابق بر سر عام سزا دے کر پورے معاشرے کو جرائم سے پاک کرنے میں جو مدد حاصل ہوتی ہے وہ پوشیدگی کے ساتھ سزا دینے والے ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر سعودی عرب میں چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا نافذ ہے۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پوری دنیا کے مقابلے میں سعودی عرب میں چوری کی واردات نہ ہونے کے برابر ہے، جب کہ وہ ممالک جہاں نام نہاد انسانیت کی بنیاد پر چوری پر معمولی قسم کی سزائیں دی جاتی ہیں، وہاں چوری کی وارداتیں زندگی کی معمولات کا حصہ ہیں۔

مجھے یاد آیا کہ ۱۹۹۳ء میں پہلی بار عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے حرمین حاضر ہوا۔ میں نے بازار سے گزرتے ہوئے اہل خانہ کے لیے ایک تحفہ خریدا۔ جب مسجد نبوی کے دروازے سے گزرنے لگا تو ذمہ داروں نے مجھے روک لیا اور کہا کہ آپ اس پیکٹ کو اندر نہیں لے جا سکتے۔ میں نے عرض کیا کہ میری رہائش گاہ بہت دور ہے، اس لیے مجھے وہاں جانے میں کافی وقت لگ جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ آپ اسے باہر کی ریلنگ میں رکھ دیں اور اطمینان رکھیں کوئی لے کر نہیں جائے گا۔ میں نے اسے باہر رکھ دیا۔ جب مسجد نبوی سے باہر نکلا تو اسے لینا بھول گیا۔ رہائش گاہ پہنچ کر یاد آیا کہ میں تو پیکٹ بھول آیا ہوں۔ قصہ مختصر یہ کہ جب میں دوسرے دن مسجد نبوی پہنچا تو میری حیرت دو چند ہو گئی کہ وہ پیکٹ اب تک یوں ہی پڑا تھا۔ بلاشبہ یہ اسلامی طرزِ سزا ہی کا فیضان تھا، ورنہ تو شاید ہی دنیا کے کسی علاقے میں چوری سے اس قدر لوگ خوف زدہ رہتے ہوں گے۔

اور پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ سزا کے طور پر قتل ہونے والا تو بہ ہر حال اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اسے اس سے کیا غرض کہ اسے سب کے سامنے قتل کیا جا رہا ہے یا اندھیرے کمرے میں، لیکن کیا یہ بہتر نہیں کہ جب وہ جان دے ہی رہا ہے تو اس طرح دے کہ دوسروں کا بھی کچھ بھلا ہو جائے۔ جرائم کی دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ بند کمرے میں دی گئی

سزا سے مرنے والا مر تو جاتا ہے، لیکن اس کی موت سے دوسروں کا شاید ہی بھلا ہوتا ہو، جب کہ سرِعام سزا دینے کی وجہ سے بہت سارے جرائم پیشہ افراد اس درجہ خائف ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی راہ ہی تبدیل کر لیتے ہیں۔

میری یہ مکمل گفت گو ان کے ساتھ انگریزی زبان میں ہو رہی تھی، لہٰذا دمِ رُخصت چلتے چلتے مَیں نے کہا کہ

"The concept is right, but may be the application is wrong."

یعنی بر سرِعام سزا دینے کا تصور بلاشبہ صحیح ہے، مگر اس کے نفاذ میں ان سے غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔

مَیں نے مُڑ کر دیکھا کہ ان کے چہرے پر اطمینانِ قلبی کے آثار نمایاں تھے۔

درسِ عبرت ہے اِس جہاں کے لیے

ملی افلاس کا یہ حال ہے کہ موجودہ دور میں اپنوں کی ایسی مثالیں بھی نہیں ملتیں جنھیں ہم نمونہ عمل کی حیثیت سے پیش کر سکیں

اگر یہ سچ ہے کہ مغربی ممالک کے لیبیا پر حملے کے پیچھے صرف ''جذبہ اِنسانی ہم دردی'' نہیں بل کہ کچھ درپردہ مقاصد بھی کارفرما ہے، تو اس سے بڑا سچ یہ ہے کہ معمر القذافی کے دورِ حکومت میں عوام نے وہ جور و جفا، ظلم و ستم اور درد و الم کی لہریں برداشت کی ہیں کہ جن کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔ صحیح کہا ہے کہنے والے نے کہ ''کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا'' اس لیے اگر حقیقت جاننے کی خواہش ہے تو ان سے رابطہ کیجیے جنھوں نے چند سال لیبیا کی سرزمین پر بسر کیے ہوں، یا ان لوگوں سے ملاقاتیں کی ہوں جو جبر و اِستبداد کا شکار ہوئے ہوں۔ لیکن ان سب کے باوجود صرف ایک ہی جہت سے ان کے ۴۲ سالہ دورِ اِقتدار کو دیکھنا اور دوسری جہت سے دانستہ چشم پوشی کر لینا عدل و انصاف کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ کام انھوں نے اچھے بھی کیے ہیں۔ مثال کے طور پر جمعیة الدعوة الاسلامیة العالمیة کا قیام۔ اس تنظیم کی مرکزی مجلس شوریٰ میں عالمِ اسلام کے بعض مسلم قائدین بھی ممبر رہے ہیں۔ اس تنظیم نے دو جہتوں پر کام کیا، یعنی عالمی سطح پر مسلمانوں کی مالی اعانت بھی کی اور دوسری جانب پوری دنیا سے مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا اہتمام۔ پہلی جہت کے پس منظر میں پوری دنیا سینکڑوں مساجد، مدارس اور ملی خدمات کے مراکز دیکھے جا سکتے ہیں، جب کہ دوسری جہت کے اعتبار سے لیبیا، دمشق اور لندن کے تعلیمی مراکز خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ لیبیا کے شہر

طرابلس میں جو کلیة الدعوة الاسلامیه نامی مرکزی ادارہ ہے، اس میں میرے زمانہ طالب علمی کے دور میں تقریباً چالیس ممالک کے طلبہ زیر تعلیم تھے۔ ان میں بعض تو ایسے دور افتادعلاقوں سے آئے ہوئے تھے کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلام سے ناواقف تھے۔ مثال کے طور پر ہمارے زمانے میں تونگو نامی ملک سے طلبہ کا ایک دستہ آیا ہوا تھا۔ یقین جانیے وہ اسلام کے بارے میں شاید ہی کچھ جانتے ہوں۔ اسی طرح افریقہ کے نہایت ہی پس ماندہ علاقوں سے بھی بہ کثرت طلبہ آتے تھے۔ ابتدا میں بہت عرصے تک طے شدہ پروگرام کے مطابق یہاں کے فارغین کو داعی کے منصب پر فائز کر کے مختلف ممالک میں بھیجا جاتا رہا ہے، جہاں وہ حکومت لیبیا کے تعاون سے مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے۔ میرے علم کے مطابق ۱۹۹۰ء کے آس پاس جب لیبیا پر یو این او کی جانب سے اقتصادی پابندی عائد کر دی گئی تو داعی بنانے کا یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ عالمی سطح پر اس تنظیم کے زیر سایہ مسلمانوں کی خاطر خواہ خدمت کی گئی۔

ان ساری جزوی خدمات کے باوجود یہ کہنا بہر حال بجا ہے کہ ان کا دور اقتدار ان کے ہم وطنوں کے لیے کسی بھیانک آسیب سے کم نہیں تھا، لیکن اسے کیا کہیے کہ زمام حکومت تھامے رہنے کی حرص کسی نشے سے کم نہیں کہ اگر ہاتھوں میں جام اٹھانے کی طاقت نہ ہو جب بھی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کم از کم ساغر و مینا تو نگاہوں کے سامنے رہنے دیا جائے۔ جس وقت بڑی طاقتوں نے لیبیا کی فضائی حدود پر منظم حملہ شروع کیا تھا اسی وقت حالات پر نظر رکھنے والوں نے کہہ دیا تھا کہ بس اب معمر القذافی کے اقتدار کا سورج غروب ہونے والا ہے، لیکن یہ کیسی حماقت تھی کہ انھوں نے مزاحمت کا راستہ اپنایا۔ نتیجہ کیا ہوا وہ دنیا نے دیکھا۔ بے شمار جانیں تلف ہوئیں۔ ہزاروں افراد معذور ہوئے۔ لاکھوں مکانات تباہ کیے گئے۔ سڑکیں، مساجد اور قومی عمارتوں کو جو نقصان پہنچا وہ اس پر مستزاد۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہی ہوا جس کی پیشین گوئی کی گئی تھی، لیکن تباہی و بربادی، قتل و غارت گری اور لٹ جانے کے بعد۔

قارئین جانتے ہیں کہ لڑائی کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا جب مزاحمت

کاروں نے سرت نامی شہر کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ اور وہ تقریباً دو ہفتوں تک گفت وشنید کے ذریعہ تباہی و بربادی سے بچنے کی کوششیں کرتے رہے، لیکن اس کے باوجود معمر القذافی راضی نہ ہوئے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب تقریباً پورا لیبیا ان کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے اور وہ ایک ایسے شہر میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں، جہاں سامانِ رسد، خورونوش اور علاج معالجے کی سہولتیں بھی تیزی سے متاثر ہو رہی ہیں، اس کے باوجود مزاحمت کے لیے کس بنیاد پر للکارتے رہے؟

ان کے آخری لمحات کی تصویر ہم نے دیکھی ہے۔ مزاحمت کاروں کے ہاتھوں میں کس قدر بے بسی تھی۔ ۴۲ سالوں تک بلکتی، سسکتی اور کراہتی ہوئی انسانیت کو پیروں تلے روندنے والا انسان خود اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ نوجوان انھیں دھکے دے رہے تھے اور وہ ان کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ اس طرح ایک انسان کی تذلیل واہانت ظالمانہ ہے، لیکن ہمیں چاہیے کہ ماضی کے ان اوراق پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں، جن کے دامن مظلوموں کے خون سے رنگین ہیں۔ ظلم وستم کرنے والے آخرت میں تو یقینی طور پر دردناک سزا سے نوازے جائیں گے، لیکن کہتے ہیں کبھی کبھی اللہ تعالیٰ ان کے ظلم کا جزوی بدلہ انھیں اس دنیا میں بھی دے دیتا ہے۔

یقین کریں جب میں ان کی گرفتاری کی تصویر دیکھ رہا تھا تو سابع من ابریل کا خونی منظر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ ہوا یہ تھا کہ کئی سال پیش تر یونی ورسٹی کے بعض طلبہ نے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے کا ایک خفیہ پروگرام بنایا۔ اس کی بھنک کسی طرح معمر القذافی کے تفتیشی افسروں کو لگ گئی۔ انھوں نے اسے یہ کہہ کر بے دردی کے ساتھ کچل دیا کہ یہ طلبہ ملک کی موجودہ جمہوریت کے خاتمے کا پروگرام مرتب کر رہے تھے۔ عینی شاہدین بتاتے ہیں کہ بعض طلبہ کو ان کے والدوں کے ذریعہ سرعام پھانسی پر لٹکایا گیا اور ان کی لاشوں کو کئی دنوں تک لٹکنے دیا گیا۔ اس موقع پر شاطرانہ چال چلتے ہوئے معمر القذافی نے طلبہ کو یونی ورسٹی کے انتظامی امور کی ذمہ داری بھی سونپ دی۔ اب ہر سال ۷/اپریل کا دن اس حیثیت سے یاد کیا جانے لگا کہ آج ہی یونی ورسٹی کا اہتمام بھی طلبہ کے ہاتھوں میں سونپ دیا

گیا ہے۔ ظاہر ہے سمجھنے والے اچھی طرح سمجھ گئے کہ اس یادگاری دن کا درپردہ مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ لوگوں کے حافظے میں دردناک سزا کی یاد تازہ ہو جائے اور وہ اتنے سہم جائیں کہ آواز اٹھانے کی جرأت تک نہ کر سکیں۔

صاحبو! معمر القذافی کی گرفتاری، ان کی تذلیل وتحقیر اور پھر قتل.......... یہ دراصل ان تمام جابر وظالم حکم رانوں کے لیے درسِ عبرت ہے جو انسانیت پر جبر وتشدد، ظلم وستم اور قہر و غضب کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ سوچتا ہوں تو دماغ پھٹنے لگتا ہے کہ موجودہ دور میں اپنوں کی ایسی مثالیں بھی نہیں ملتیں جنھیں ہم نمونہ عمل کی حیثیت سے پیش کر سکیں۔ عالمی سطح پر ہمارے قائدانہ افلاس کا یہ عالم ہے کہ ہمیں لے دے کے وہی غیروں کی مثالیں پیش کرنی پڑتی ہیں۔ عالم اسلام میں ایک نگاہ ڈالیے تو محسوس ہوگا کہ بہ استثنائے چند یا تو کہیں بادشاہت نظر آئے گی یا کہیں ڈکٹیٹر شپ۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ موجود دور میں دونوں طرز کی حکومتوں کی وہ شکلیں نظر آتی ہیں جو عوام کے مفاد میں نہیں ہیں۔ ایسے افراد کو برطانیہ اور جاپان وغیرہ کی بادشاہت سے سبق سیکھنا چاہیے کہ انھوں نے خاموشی کے ساتھ ملک عوام کے حوالے کر دیا اور عوام نے ان کی اس قربانی کے عوض ہمیشہ کے لیے انھیں عزت دینے کا عہد کر لیا۔ اس طرح ان کی شاہانہ تمکنت بھی ہاتھ سے نہ گئی اور ملک بھی عوام کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ کہنے کو یہ کاغذی طور پر ملک کے سربراہ کہلاتے ضرور ہیں، لیکن حکومتی معاملات میں وہ ذرہ بھر دخیل نہیں۔ کاش جب طرابلس کی سرزمین پر غیض وغضب کی ایک ہلکی سی چنگاری اٹھی تھی، اس وقت معمر القذافی نے انھیں سختی سے کچلنے کے بہ جائے برطانیہ اور جاپان کے بادشاہوں سے سبق سیکھ لیا ہوتا تو بلاشبہ یہ ان کے حق میں بھی بہتر ہوتا اور ملک کے حق میں بھی۔ نہ یہ تباہی وبربادی ہوتی اور نہ ہی غیروں کو اپنے وطن میں قدم جمانے کا موقع ملتا۔ کیا عجب تھا کہ ان کی اس قربانی کے عوض لوگ انھیں اپنی آنکھوں میں رکھتے اور سروں پر بٹھاتے۔

شام مسلمانوں کا ملک ضرور مگر اِسلامی مملکت نہیں

ہر چہار جانب قتل وخون کے دھبے رات کی تاریکی میں بھی واضح نظر آئیں گے

عالم عرب کا مشہور ملک شام کئی ماہ سے داخلی شورش کا شکار ہے۔ یہاں کے عوامی احتجاجات بھی تیونس، مصر اور لیبیا میں ہونے والی عوامی بے چینی کے نتیجے میں برسوں پرانی ظالمانہ حکومتوں کے خاتمے سے ملنے والے حوصلہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ عوام کا یہ غم وغصہ وقتی طور پر یوں ہی پھوٹ پڑا ہے، بل کہ تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ شام میں کئی دہائیوں سے ظلم وجبر کی حکومت قائم ہے۔ بشار الاسد کے والد جناب حافظ الاسد بھی پوری دنیا میں ایک سخت گیر نظامِ حکومت کے بانی کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ظلم وتشدد، جور وجفا اور جبر واستبداد کے سہارے جس طرح برسوں وہ برسر اقتدار رہے، اس کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔

شام اور صدام حسین کے دور اقتدار کے عراق دونوں پڑوسی ملکوں میں نظریہ ''بعث'' کی حکومت رہی ہے۔ عام طور پر نظریہ بعث کو کمیونزم کی عربی شکل سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ بات حقیقت کی صحیح ترجمانی بھی ہے کہ اس نظریہ کے بانیوں میں لبنان کے دو عیسائیوں کا نام سامنے آتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک عیسائی سے آپ کسی ایسے نظریے کی توقع نہیں رکھ سکتے جس سے دور کا بھی کوئی تعلق شریعت اسلامیہ سے ہو۔ یہ بات اگر تسلیم شدہ ہے کہ وہ اپنے نہیں تو ان سے مذہبی معاملات میں کسی خیر کی توقع رکھنا ہی فضول ٹھہرا۔

اب ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیے کہ شام میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور مسلمانوں کے مسیحائے اعظم سرکار دو عالم ﷺ کی ہدایات کی روشنی میں حکومت کرنے کی بہ جائے کسی

عیسائی کے متعین کردہ نقوش پر عمل کرنا کس قدر افسوس ناک ہے؟ غیرت اسلامی کے جذبے سے سرشار ایک مسلمان کے لیے یہ خبر ہی کتنی الم ناک ہے، اس کا اندازہ انھیں کبھی بھی نہیں ہوسکتا جن کے دل ہوسِ اقتدار کے سائے سے سیاہ ہو چکے ہیں۔ اسے کیا کہیے کہ جس مذہب نے معاملات سلجھانے کے لیے آپسی مشورہ کو اہمیت دی ہے، اسی فکرِ عظیم کے دامن کو تار تار کرنے والے کوئی غیر نہیں اپنے ہی ہیں۔ سوچتا ہوں تو دماغ پھٹنے لگتا ہے کہ عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کی اجتماعی بے بسی اور تنظیمی غربت وافلاس نے پورے عالم اسلام کو کس قدر گہری پستی میں دھکیل دیا ہے کہ ذلت ورسوائی کے باوجود احساسِ ندامت کے آثار تک نہیں!

بات نکلی ہے تو سنتے چلیے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب عراق پر صدام حسین کی حکومت تھی۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کی صدام حسین کے دور میں نظریہ بعث کے طے کردہ اصولوں کے مطابق حکومت کے شب وروز گزرتے تھے۔ جس طرح دیگر جمہوری ملکوں میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے سالانہ اجلاس ہوا کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح بعث پارٹی کا بھی سالانہ کنونشن منعقد ہوا۔ یہ بات آج بھی میرے حاشیہ ذہن میں محفوظ ہے کہ اس جلسے کے دوران ملک میں ہونے والی دینی بیداری پر شدید تشویش کا اظہار کیا گیا اور اسے حتی الامکان روکنے کے حوالے سے نہایت ہی بے غیرتی کے ساتھ ایک قرارداد بھی پاس کی گئی، جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

''ملک تیزی کے ساتھ رجعیت کی طرف جارہا ہے، لہٰذا ہمیں اسے علمانیت کی جانب پھیرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے''

عربی اصطلاح کے مطابق ''رجعیت'' کے لفظ سے مذہب پسندی مراد لیا جاتا ہے اور ''علمانیت'' سے مغرب پسندی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جس پارٹی کی سالانہ مجلس عاملہ کی نشست میں مذہب بیزاری کے لیے لائحہ عمل مرتب کیا جارہا ہو، اس سے کیا یہ امر دوپہر کی دھوپ کی طرح عیاں نہیں ہوجاتا کہ بعث پارٹی مسلم دوست نہیں، بل کہ اسلام دشمن عناصر کی آماج گاہ ہے۔ اس طرح کے نظریے کے پاسدار یہ تو کرسکتے ہیں کہ کسی بھی قیمت پر

بشار الاسد منصبِ صدارت سے چپکے رہیں، لیکن ان سے ملت اسلامیہ کی نصرت وحمایت کی توقع رکھنا کسی طور مناسب نہیں۔ یقین نہیں آتا تو گذشتہ چند مہینوں میں قتل وغارت گری کے لرزہ خیز واقعات کا ایک سرسری جائزہ لیجیے۔ ہر چہار جانب قتل وخون کے دھبے رات کی تاریکی میں بھی واضح نظر آئیں گے، اپنے لخت جگر کی شہادت پر ماؤں کی سسکیوں کی آوازیں صاف سنائی دیں گی، اجڑی ہوئی آبادیاں ظلم وبربریت کی داستانیں کہتی ہوئی محسوس ہوں گی اور رونگٹے کھڑے کردینے والی ہول ناک آہوں سے دھڑکتا ہوا دل ڈوبتا ہوا لگے گا۔ یہ ''سزائیں'' صرف اس قصور کی پاداش میں ہیں کہ انھوں نے کئی دہائیوں سے ہورہے بے جا ظلم وتشدد کے خلاف آواز بلند کرنے کی جسارت کی ہے۔

صاحبو! ملک شام میں جس قسم کی جابرانہ پالیسی نافذ ہے، اس کی ایک واقعی جھلک دیکھنی ہو تو سنیے کہ لیبیا میں ہم سبق ساتھیوں میں چند شامی طلبہ بھی تھے۔ ایک روز شامی طلبہ کے ساتھ ہماری مجلس میں صدرِ مملکت حافظ الاسد کی پالیسی کے حوالے سے بات نکل پڑی۔ ہمارے ساتھی مولانا ڈاکٹر سید علیم اشرف اسسٹنٹ پروفیسر مولانا آزاد یونی ورسٹی حیدرآباد نے حافظ الاسد کی سخت گیر نظامِ حکومت پر تنقید کی۔ ہم نے محسوس کیا کہ شامی طلبہ کے چہرے پر کسی طرح کا کوئی احساس تک نہ تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ بادلِ ناخواستہ سر جھکائے ہماری معروضات سنتے رہے، پھر پوری کوشش شروع کردی کہ ہم اس موضوع کو تبدیل کردیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بل کہ جب مولانا علیم اشرف نے عوامی احتجاج کو سختی کے ساتھ کچلنے کے لیے شہر حمص میں حافظ الاسد کے ذریعہ تباہ وبرباد کرنے کا تذکرہ کیا تو وہ سب کے سب پہلو تہی کرتے ہوئے اسے خلافِ واقعہ قرار دینے لگے۔ واضح ہو کہ شہر حمص ملک شام کا وہ شہر ہے جو سادات مشائخ کرام کے روحانی مراکز کے حوالے سے خاصا مشہور ومعروف تھا۔ یہاں کے علاقے صوفیۂ کرام کے قدموں کی برکتوں سے رحمت وانوار کے سائے میں ہمہ وقت منور ومجلّٰی رہا کرتے تھے۔

محفل برخواست ہوچکی تھی اور ہم سب اپنے مستقر واپس لوٹ رہے تھے۔ یہ بات ہمارے لیے عجیب وغریب تھی کہ اتنی بڑی تاریخی حقیقت کو کس طرح خود وہاں کے حاضر

باش خلافِ واقعہ قرار دے رہے ہیں؟ آخر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ راز جو عالمی میڈیا کے ذریعہ طشت از بام ہو چکا ہو اس کی اتنی شدت کے ساتھ تکذیب کر دی جائے؟ بہ ہر کیف ہم نے ایک دوسرے کو سلام کے ساتھ رخصت کیا اور بستر پر آرام کے لیے لیٹ گئے۔

یہ بات اب تک میرے حاشیہ ذہن میں تازہ ہے کہ دوسرے دن جب میں ان شامی طلبہ میں سے ایک کے ساتھ دوپہر کے کھانے کے لیے دار الطعام جا رہا تھا تو بات پھر حافظ الاسد کی ایما پر کیے جانے والے ظلم و تشدد، جور و استبداد اور قتل و غارت گری کے حوالے سے شروع ہو گئی۔ شدتِ کرب کے جذبات سے مغلوب ہو کر ناگواری کے ساتھ میں کہہ پڑا کہ تم بھی کتنے بے حس ہو کہ مسلمانوں پر ہونے والی ناانصافیوں پر صدائے احتجاج بلند کرنا تو درکنار تم سب ظالمانہ کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہو۔ میں نے اپنا جملہ ابھی مکمل بھی نہ کیا تھا کہ وہ نوجوان بول پڑا کہ شیخ زرقانی! تم واقعی سچ کہہ رہے ہو۔ کل تمہارے ساتھی نے شہر حمص پر حکومت کی سرپرستی میں ہونے والے جس وحشیانہ بربریت کی طرف اشارہ کیا تھا وہ نہ صرف حرف بہ حرف درست ہے بل کہ حقیقت میں وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

اس اعترافِ حقیقت پر مَیں ہکا بکا رہ گیا۔ یقین جانیے میں کبھی اس کے چہرے کو دیکھتا اور کبھی گذشتہ شب ہونے والی حکومت کی پرزور حمایت کے الفاظ کی تعبیر کرنے کی کوشش کرتا۔ دونوں خیالات میں اس قدر بعد تھا کہ سعیِ بسیار کے باوجود بھی میں کوئی ایسی راہ نہ نکال سکا کہ جس کے سہارے عارضی طور پر ہی صحیح کوئی موافقت پیدا کر پاتا، بس میں ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ میرے استفہامیہ اندازِ نظر کا اشارہ سمجھتے ہوئے وہ بول پڑا:

"شیخ زرقانی! بات دراصل یہ ہے کہ جب ہم سب اکٹھے بیٹھے تھے تو وثوق کے ساتھ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ہم میں سے کون حکومت کا جاسوس ہے۔ بس یہی وجہ تھی کہ ہم سب نے عافیت اسی میں سمجھی کہ حکومت کے خلاف زبان نہ کھولی جائے۔"

اِس انکشاف پر میری حیرت دوچند ہوئی جا رہی تھی۔ تجسس بھرے لہجے میں پوچھ بیٹھا:

"فرض کرو ان میں کوئی حکومت کا جاسوس ہوا بھی تو تمہارا کیا بگاڑ لے گا؟"

میرے اس سوال پر اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ گلوگیر آواز میں کہنے لگا:

"شیخ زرقانی! تم نہیں جانتے کہ ارباب اقتدار کس قدر خوں خوار اور ظالم و جابر ہیں...... انھیں یہ بھنک لگ جائے کہ میں نے حکومت کے خلاف زبان کھولی ہے تو میرا نام باغیوں میں شمار کر لیا جائے گا...... بس پھر کیا میں جوں ہی ائر پورٹ پہنچا اور حاشیہ زمین سے غائب...... تملق پسند کارندے میری آزادی چھین لیں گے...... کال کوٹھری میں ڈال دیا جاؤں گا...... اور پھر کوئی دادرسی کے لیے قریب پھٹکنے کی بھی جرأت نہ کر سکے گا۔"

"مفاد پرستانہ" نہیں "دین دارانہ" اِتحاد کی ضرورت ہے

تنظیم عالم اِسلامی کے موجودہ سربراہی اجلاس میں اِتحادِ ملت کا نعرہ محض مفاد پرستانہ ہے

اِسلامی ممالک کی سب سے بڑی تنظیم او آئی سی کا سربراہی اجلاس سعودیہ عربیہ میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس اس لیے بھی تاریخی سمجھا جائے گا کہ اسے ماہ رمضان المبارک کے مقدس ترین عشرہ میں انعقاد پذیر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، جس کی صدارت سعودیہ عربیہ کے فرماں روا شاہ عبداللہ نے کی۔ ۵۷ر اسلامی ممالک کی متحدہ عالمی تنظیم کا یہ اجلاس ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب کہ شام، فلسطین، برما اور آسام کے مسلمانوں کے سروں پر مصائب وآلام کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔

ایک طرف شام کی جابرانہ حکومت کی فوج نے خود اپنوں پر ہی توپوں کے دہانے کھول رکھے ہیں تو دوسری طرف برما کی ظالمانہ جنتا حکومت کی سرپرستی میں روہنگیا مسلمانوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے، تیسری جانب آسام میں بسنے والے مسلمانوں پر بوڈو تنظیم کا ظلم وقہر ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہا ہے۔ اطلاعات کے مطابق تین چار لاکھ مسلمان اپنی جان بچانے کے لیے کیمپوں میں مقیم ہیں۔ چوتھی جانب فلسطین کے سیاسی حقوق کو غصب کرنے والی صہیونی حکومت ایران پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہی ہے۔

اس طرح موجودہ حالات کو بلاشبہ ملت اسلامیہ کے لیے نازک ترین دور کہا جاسکتا ہے۔ بی بی سی کے نامہ نگار کے مطابق اجلاس کے موقع پر شاہ عبداللہ نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ایران کے صدر احمدی نژاد کا استقبال کیا اور انھیں اپنے بغل میں بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔ کہتے ہیں کہ یہ علامتی طور پر اس بات کا اعلان تھا کہ او آئی سی کے ممبران کے درمیان

اب اتحاد واتفاق کے ایک نئے دور کا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ اس کی تائید فرماں روائے سعودیہ عربیہ شاہ عبداللہ کی اپیل سے بھی ہوا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں باہمی اختلافات بھلا کر ملت اسلامیہ کو متحد ہونے پر زور دیا۔ مجھے ہفتہ عشرہ روز قبل سعودی عرب کا وہ بیان یاد آیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اگر ایران پر فضائی حملہ کرنے کے لیے اسرائیل سعودی عرب کے فضائی حدود سے گزرنا چاہے گا تو ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی، لیکن اگر یہ حملہ امریکہ کی سرپرستی میں ہوا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یعنی ایک طرف وہ ایران کے ساتھ "حمایت ونصرت" کا اظہار بھی کر رہا ہے اور دوسری طرف اسے "تباہ وبرباد" کرنے کی کوششوں میں بھی شرکت کرنے کا عزم کر رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں "پراسرار سادگی" اور پھر یہ مصرع بے ساختہ زبان پر جاری ہو جاتا ہے کہ

ع   اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!

اس طرح کی افسوس ناک پالیسی سعودی عرب کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ صدام حسین کے دور حکومت میں عراق کی سرزمین پر اسی طرح کا سربراہی اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اجلاس کے بعد صدام حسین نے فخریہ انداز میں سربراہانِ مملکت کو اپنی ایٹمی صلاحیت کے حوالے سے مطلع کیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد اسرائیل سے کئی ایک جنگی جہاز اڑ کر گئے اور عراق کی ایٹمی صلاحیت تباہ وبرباد کر دی گئی۔ ضبط وشکیب کر سکیں تو سنیے کہ اسرائیل کے یہ جنگی جہاز سعودی عرب کی فضائی حدود سے گزر کر ہی عراق کی سرحدوں میں داخل ہوئے تھے۔ یہ حملہ صدام حسین کے لیے اس قدر غیر متوقع تھا کہ اس کا فوجی دفاعی نظام اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کر سکا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسرائیل کے جہاز عراق پر حملے کے بعد بہ حفاظت اپنے وطن واپس بھی آ گئے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اپنے پڑوس میں ایک عرب مسلم ملک ہونے کی وجہ صدام حسین کی فوج اس جانب سے دشمن کے کسی ممکنہ حملے کے حوالے سے قدرے مطمئن رہی ہو اور اپنے دفاعی نظام کی ساری قوت ان اطراف میں مرکوز کر رکھی ہو جہاں سے حملے کا شبہہ ہو۔ بہ ہر کیف حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل کی منظم فوج کشی سے عالم عرب میں ابھرتی ہوئی فوجی طاقت کی کمر ٹوٹ

گئی اور وہ دھیرے دھیرے بکھر گئی۔

حالات کے نشیب و فراز پر نگاہ رکھنے والوں پر یہ امر مخفی نہیں کہ سعودی عرب میں ہونے والے او آئی سی کے سربراہی اجلاس کے انعقاد کا اصل مقصد کیا تھا؟ آخر اس قدر عجلت میں اور وہ بھی آخری عشرہ رمضان میں عالم اسلام کے سربراہوں کا اجتماع ہونا کوئی عام سی بات نہیں۔ ان دنوں میں تو ایک عام مسلمان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیاوی علائق سے دور ہو کر یکسوئی کے ساتھ عبادت و ریاضت میں اپنے شب و روز گزارے۔ اس لیے یہ سمجھ لینا کہ منعقدہ سربراہی اجلاس مسلمانوں کے وقار و تمکنت کی بازیابی کے لیے ایک منظم لائحہ عمل ترتیب دینے کے پیش نظر ظہور پذیر ہوا تھا، سرتاسر حقیقت سے کوسوں دور ہوگا۔ کہیے تو صاف صاف عرض کردوں کہ اس کانفرنس کا سوائے اس کے اور کوئی دوسرا بنیادی مقصد نہیں تھا کہ شام کے خلاف ملت اسلامیہ کو ایک صف میں کھڑا کردیا جائے۔ ایران کے ساتھ ''عنایاتِ خسروانہ'' کے پس پشت بھی یہی راز پوشیدہ ہے کہ علاقے میں ایران ہی وہ واحد ملک ہے جو شام کی حمایت میں روس اور چین کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ۵۷ ممالک پر مشتمل او آئی سی ممبران کی لمبی چوڑی فہرست میں ایران ہی وہ تنہا ملک ہے جو کھل کر شام کے ساتھ بھی ہے اور ایک حد تک فوجی اعتبار سے طاقت ور بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے توڑنے کے لیے ترغیب و ترہیب کے دونوں طریقے آزمائے جارہے ہیں، یعنی ایک طرف اسرائیل کے ممکنہ حملے سے خائف بھی کیا جارہا ہے اور دوسری طرف پیار و محبت کے ساتھ لبھانے کی سعی بھی کی جارہی ہے۔

ان روشن و تابناک حقائق کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حالیہ سربراہی اجلاس میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی گونج ملت اسلامیہ کی خیرخواہی کے جذبے میں نہیں ہے، بل کہ یہ سب کچھ اپنے ایک متعینہ مفاد کے حصول کی غرض سے ہے، اور وہ ہے شام کے افق پر نئی سیاسی قیادت کے طلوع کو کامیابیوں سے ہم کنار کرنے کی کوشش۔

اب یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے کہ اجلاس میں فلسطین اور برما کے مسلمانوں کا تذکرہ کیوں کر آگیا؟ ایک عقل مند انسان حتی الامکان کوشش کرتا ہے کہ اس کے خفیہ اہداف کا

اظہار اس کے عام اقدامات سے نہ ہونے پائے، یہی وجہ ہے کہ سربراہی اجلاس میں بے چارے برما کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کا خیال بھی آگیا اور فلسطین کا تذکرہ بھی ضمنی طور پر کر دیا گیا تاکہ او آئی سی کو کسی حد تک عالمی ملی مسائل پر غور و خوض کی کامیاب کوششوں کا اسٹیج کہا جاسکے۔ واضح رہے کہ میں شام کی موجودہ جابرانہ حکومت کا حامی نہیں ہوں، لیکن اس قدر ضرور خواہش ہے کہ یہ مسئلہ آپسی افہام و تفہیم سے حل ہوجائے تو کہیں بہتر ہے۔ لہٰذا نہ حکومت کی جانب سے خود اپنے شہریوں کے خلاف ہتھیاروں کے استعمال کو جائز ٹھہرایا جاسکتا ہے اور نہ ہی فوجیوں کے خلاف مظاہرین کی طرف سے مسلح جد و جہد کی تائید کی جاسکتی ہے۔

صاحبو! اسی لیے میں کہتا ہوں کہ حالیہ سربراہی اجلاس میں سعودی عرب کے فرماں روا شاہ عبداللہ نے مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد و اتفاق کا جو نعرہ لگایا ہے وہ ''دین دارانہ'' نہیں بل کہ ''مفاد پرستانہ'' ہے۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کے کھوکھلے مفاد پرستانہ نعروں سے کبھی بھی ملت اسلامیہ کی تقدیر بدل نہیں سکتی۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ لچھے دار طرز بیان سے دنیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے کروڑوں مسلمانوں کا دل وقتی طور پر جیت لیا جائے، لیکن میدانِ فکر و عمل میں واقعی جیت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ملت اسلامیہ کے کھوئے ہوئے وقار و تمکنت کے حصول کے لیے ہمیں ایسے اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے جس کی بنیاد ''اخلاص'' پر ہو، ''نیک نیتی'' پر ہو، اور ''خیر خواہی'' پر ہو، نیز سب سے بڑھ کر یہ کہ سربراہانِ مملکت اپنے ''ذاتی مفادات'' کو قربان کرکے صرف اور صرف ''ملی مفاد'' کے لیے اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کریں۔

مرنے والوں کے حقوق فراموش نہ کیے جائیں!

جولوگ اپنے محسنوں کے احسانات بھلادیتے ہیں وقت بھی انھیں بھلادیتا ہے

ہم یہ کہتے نہیں تھکتے کہ دین اسلام ہمیں سبھوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے اور وسیع وعریض کائنات میں پھیلی ہوئی مخلوقات کے حقوق ادا کرنے کی ہدایت بھی دیتا ہے، لیکن عملی طور پر جب ہم اس پس منظر میں دنیا کے شب وروز پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں تو فکروعمل کا یہ تضاد سیاہ بادل کی اوٹ میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کی طرح ہمیں شرمندہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ صد افسوس کہ انتہاک حرمات کا یہ سلسلہ انسانی آبادیوں سے دراز ہوتے ہوئے قبرستان تک جا پہنچا ہے اور یہ بلاشبہہ اسی فکری شدت پسندی کا براہِ راست نتیجہ ہے جس کا آغاز سعودی عرب کی سرزمین پر برسوں پہلے ہوا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ وہابی تحریک کے نتیجے میں برسر اقتدار آنے والی حکومت نے حجازِ مقدس کی سرزمین پر ایک طرف زندوں کے حقوق کے ساتھ کھلواڑ کیا تو دوسری طرف قبرستان میں لیٹے ہوئے اہلِ بیتِ اطہار، صحابہ، تابعین اور ہزاروں علمائے کرام کے حقوق کا بھی پاس نہ رکھا۔ سچ کہا ہے کہنے والوں نے کہ جو مذہبی شدت پسندی کے نشے میں مست ہو جائے اسے حق وباطل، بھلے برے اور جائز وناجائز کے درمیان حدِ فاصل کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں اس تحریک کے اثرات صرف حجاز مقدس کے اطراف وجوانب ہی تک محدود تھے، لیکن پیٹروڈالر کی بہتات کے ساتھ ساتھ یہ تحریک بھی تیزی سے دنیا کے کونے کونے تک پہنچ رہی ہے۔ جاذبِ نظر عبایہ، ہاتھوں میں تسبیح اور سر پر اچھوتے ڈھنگ سے باندھے ہوئے رومال کی وجہ سے ایک عام مسلمان کا فریب زدہ ہو جانا جائے حیرت نہیں۔ اس پر

مستزاد یہ کہ مہبطِ وحیِ الٰہی سے تعلق خاص اور پھر زبانِ عربی میں اظہار خیالات پر قدرت نے انھیں دنیا کے سامنے خود کو مذہب کا ٹھیکے دار بنا کر پیش کرنے میں بھی کسی قدر معاونت کی ہے۔

ابھی حال ہی میں لیبیا سے معمر القذافی کی حکومت کے خاتمے کے بعد اسی تحریک کے شدت پسندوں نے قبروں میں آسودۂ خواب اپنے محسنوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ نہایت ہی قابل افسوس ہے۔ ۲۳ر ستمبر ۲۰۱۲ء کو طرابلس میں معروف صوفی بزرگ عبداللہ شہاب کے مزار اور ملحقہ دوسری قبروں کو نقصان پہنچایا گیا۔ علاقے کے رہائشیوں کے بیان کے مطابق سنیچر کی صبح بلڈوزوں کے ساتھ چند لوگ وارد ہوئے اور قبروں کی مسماری شروع کردی۔ غیض وغضب کے نشے میں وہ اس قدر چور تھے کہ صوفی بزرگ کے قریب ہی بنی ہوئی مسجد بھی صرف اس لیے توڑ دی گئی کہ لوگ مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد یہاں نمازیں ادا کرتے تھے۔ اسی طرح لیبیا کے مشہور ومعروف شہر زلیتن میں واقع سیّدی عبدالسلام کی قبر کے ساتھ بھی بے حرمتی کی گئی۔

مَیں نے لیبیا میں اپنے زمانۂ قیام کے دوران یہ مزار دیکھا ہے۔ ہوا یوں کہ ہمارے احباب میں ایک صاحب جنھیں ہم اعظم بھائی کہتے تھے، وہ یہیں کے رہائشی تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ اپنے دولت خانے میں دینی تقریب کا انعقاد کیا تھا۔ ہم سب بہ ذریعہ کاران کے گھر گئے تھے۔ اتفاق سے ان کے گھر کی بالکونی سے جب ہم نے شہر کا مشاہدہ کیا تو بالکل سامنے ہی ایک بڑی ہی پرکشش عمارت نظر آئی۔ ہمارے استفسار پر بتایا گیا کہ یہ سیدی عبد السلام کا مزار ہے۔ لوگ کہنے لگے کہ جس طرح برصغیر ہندوپاک میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کے حوالے سے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری ؒ کا نام محتاجِ تعارف نہیں، بالکل اسی طرح یہاں سے ملحقہ علاقوں میں اسلام کی ترویج واشاعت میں سیدی عبدالسلام کا نام عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ آپ کی مساعیِ جمیلہ سے بڑی تعداد میں لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ اس انکشاف کے بعد اشتیاق فزوں تر ہوتا چلا گیا اور ہم دوسری صبح فاتحہ پڑھنے کے لیے مزار پر حاضر ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ قبر پر سلیقے سے چادر چڑھی ہوئی ہے اور لوگ اردگرد کھڑے اپنی عقیدتوں کا خراج پیش کررہے ہیں۔ سوچتا

ہوں تو دماغ پھٹنے لگتا ہے کہ ایک طرف سیدی عبدالسلام کی بے لوث دینی خدمات کے اَن مٹ نقوش اور دوسری طرف ان کی قبر کے ساتھ ہونے والی بے حرمتی؟ صد افسوس کہ لوگوں نے اپنے محسنوں کے احسانات کا بھی خیال نہ رکھا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھی جائے کہ یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا ہے، بل کہ عینی شاہدین کے مطابق پولیس نے باقاعدہ سڑکیں بند کردی تھیں تاکہ عقیدت کیش علاقے میں داخل نہ ہو پائیں۔

اسی طرح کے افسوس ناک اقدامات افریقہ کے ملک مالی میں بھی ہو رہے ہیں۔ یہاں پر انصار داعیین نامی شدت پسند تحریک کے عزائم بھی وہابیت سے عبارت ہیں۔ اس گروپ نے مسلح جدوجہد کے ذریعہ مالی کے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ جولائی ۲۰۱۲ء میں مالی کے تاریخی شہر ٹمبکٹو کی معروف و مشہور مسجد جسے پندرھویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا اسے انھوں نے مسمار کردیا۔ یہ مسجد شیخ سدی یحیی کی شخصیت سے منسوب تھی۔ اقوام متحدہ میں ثقافتی ورثے سے متعلق ادارہ یونیسکو کے مطابق اس مسجد کا شمار ٹمبکٹو کے تین ثقافتی ورثے میں ہوتا تھا۔ بی بی سی کی ملاقات میں انصار داعیین کے ترجمان سانڈا آولڈ بمانا نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ خود ہی اپنی تحریک کے مذموم عزائم سے نقاب الٹتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ ہم نے تقریباً ۹۰ فی صد اپنے اہداف پورے کرلیے ہیں اور ایسی تمام زیارت گاہوں کو برباد کردیا ہے جو شریعت کے خلاف ہیں۔ اس اعتراف کے بعد یہ کہنے میں کوئی شک وشبہہ نہیں کہ اس تحریک کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ اپنے محسنوں کی قبروں کو تباہ و برباد کیا جائے۔ سنا تھا کہ انسان اپنے اوپر کیے ہوئے دوسرے انسان کے احسانات کو یاد رکھتا ہے، لیکن موجودہ عہد کے شدت پسند اقدامات سے اخلاق وکردار کے سارے ضابطے خود ہی شرمندہ دکھائی دیتے ہیں۔

کیا یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ افریقہ کے دور دراز تک کے وسیع وعریض خطے میں شجرِ اسلام کا یہ لہلہاتا ہوا چمنستان کن نفوسِ قدسیہ کی جدوجہد کا نتیجہ ہے؟ آنکھیں ہوں تو ماتھے کی سیدھ پر مساجد کی فلک بوس عمارتوں کا مشاہدہ کریں، سینے میں دھڑکتے ہوئے دل ہوں تو قبلہ رخ کھڑی ہونے والی جماعتوں کے پس پشت اسباب وعلل کا سراغ لگائیں اور

صدائے حق سننے کی تاب ہو تو قرآنِ مقدس کی آیات سے گونج اٹھنے والی محافلِ دینیہ کے وجوہات کا جائزہ لیں، میرا وجدان پکار رہا ہے کہ براعظم افریقہ کے چپے چپے سے بس یہی صدا آتی ہوئی محسوس ہوگی کہ نگار خانۂ قدرت میں دین اسلام کی لہلہاتی ہوئی فصلِ بہار جن کے قدموں کی برکتوں سے ظہور پذیر ہوئی وہ یہی وفاکیش صوفیۂ کرام کی جماعت تھی۔ یہ وہ سرفروش دُعاۃِ اسلام کا دستہ تھا کہ نہ جنھیں کھانے کی فکر تھی اور نہ ہی پہننے کی، نہ عمدہ رہائش کا خیال تھا اور نہ ہی دنیا کی لذتوں سے آشنائی کا، بس ایک ہی غم تھا اور وہ تھا پیغامِ اسلام کی نشر و اشاعت۔ اس مقصد اولی کے لیے انھوں نے اپنی واقعی حیثیتوں کو فراموش کردیا، نفسانی جذبات کا گلا گھونٹ دیا اور عیش وآرام کی ساری رعنائیوں کو جیتے جی اپنے ہاتھوں سے دفن کردیا۔

صاحبو! کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس دنیا میں اگر کوئی ہماری جانب دستِ تعاون دراز کردیتا ہے تو ہم زندگی بھر اس کے ممنون رہتے ہیں؟ اگر واقعی یہی تقاضائے فطرت ہے تو پھر ہمیں ان مقدس ترین ہستیوں کی دینی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ جن کی متوارث کوششوں سے ہمارے آباء واجداد کفر وشرک کی تاریکیوں سے ایمان کے اجالے میں آسکے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بعض قبروں پر بسا اوقات نادان لوگ ایسی ایسی حرکتیں کر جاتے ہیں جن کا تعلیماتِ اسلامی سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم سرے سے قبروں کو ہی مسمار کردیں کہ یہ تو ایک چھوٹی غلطی کا علاج دوسری بڑی غلطی کے ذریعہ کرنے کے مترادف ہوا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ ایک طرف ہم ان مسلمانوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں جو نا سمجھی میں غلطی کر جاتے ہیں، دوسری طرف ملت اسلامیہ پر احسان کرنے والے صوفیۂ کرام کی قدر و منزلت کا بھی خیال رکھیں۔

لیجیے شام کی توپیں اب خاموش ہوگئیں!

بالآخر بیرونی سیاسی مداخلت سے ہی بات بنی،
کاش گھر کے لوگ ہی گھر کے مسائل سلجھا لیتے!

اللہ کا بے پایاں شکر و احسان کہ مہینوں کی قتل وغارت گری، جور و ستم اور ظلم و تشدد کے بعد اب شام کی توپیں خاموش ہوگئی ہیں۔ شام میں عوامی بے چینی کی شروعات ۲۶ رجنوری ۲۰۱۱ء میں اس وقت ہوئی جب ملک کے کئی ایک شہروں میں بشار الاسد کے خلاف مظاہرے کیے گئے۔ عوام کا مطالبہ یہ تھا کہ صدر بشار الاسد عصر حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر سیاسی اصلاحات کی طرف توجہ دیں اور آزادی کے ساتھ ملک کے شہریوں کو موقع دیں کہ وہ اپنے بہتر مستقبل کے لیے جسے چاہیں منتخب کرسکیں، لیکن ان کے احتجاجی مظاہرے سختی کے ساتھ کچلے جاتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طرف سے زیادتیاں ہوئیں۔ اقوامِ متحدہ کی ایک محتاط رپورٹ کے مطابق ۱۳۵۰۰-۱۱۱۱۵ رکی تعداد میں لوگ مارے گئے، جن میں ۴۳۴۵-۳۸۱۵ کے قریب مسلح جنگ جُو میں شامل ہیں۔ دوسری طرف حکومتِ شام کے مطابق ۷۸۲۵-۷۳۰۰ کے قریب انسان مارے گئے ہیں جن میں ۳۲۳۰-۲۷۰۰ فوجی جوان، ۱۱۱۵ رمسلح جنگ جُو اور ۳۵۰۰ عام شہری شامل ہیں۔ یہ تو انسانی جانوں کے تلف ہونے کی تخمینی تعداد ہے، جب کہ اسلحے کی زد میں آکر زخمی یا معذور ہونے والوں کی صحیح تعداد تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس ایک سال کی شورش کے نتیجے میں تقریباً ایک لاکھ سے زائد لوگ بے گھر ہوچکے ہیں جو کہ شام کے سرحدی ممالک ترکی اور اردن کے علاقے میں خیمہ زن ہیں۔ اسی کے ساتھ ان علاقوں کی تصاویر بھی نگاہوں میں رہے جو تباہی و بربادی کے فسانے سنانے

کے لیے ہنوز ٹوٹے پڑے ہیں۔ ہیومن رائٹس واچ کی رپورٹ کے مطابق اس لڑائی کے دوران جہاں حکومتی اہل کاروں نے اپنے شہریوں پر زیادتیاں کی ہیں، وہیں مسلح جنگ جُوؤں سے بھی اپنے مخالفین کی سرکوبی کے دوران بے جا اذیت رسانی کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ۶۰۰ سے زیادہ سیاسی مخالفین حکومتی اہل کاروں کے ہاتھوں دورانِ تفتیش مارے جاچکے ہیں۔ اسی طرح شہریوں کو اپنے تحفظ کے لیے ڈھال بنانا، انھیں اغوا کرنا اور زدوکوب کرنے کا الزام بھی مسلح جنگ جُوؤں پر لگایا جاتا رہا ہے۔

ہوسکے تو ذرا غور کریں کہ ان سب کا نتیجہ کیا نکلا؟ خواہ مسلح جنگ جُوؤں کی جانب سے تباہی و بربادی ہوئی ہو یا حکومتی سرپرستی میں، بہ ہر حال نقصان تو اپنا ہی ہوا۔ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ لوگوں کو امن کے ساتھ احتجاجات کی اجازت دے دی جاتی جو کہ ہر انسان کا پیدائشی حق ہے؟ اب اسے کیا کہیے کہ جب عرب لیگ نے اس مسئلے کے پایہ دار حل کے لیے کوششیں کی تھیں تو شام کی جابرانہ حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور وہ اپنوں کی ساری درخواستیں بے اعتنائی کے ساتھ پس پشت ڈالتے رہے اور اب جب کہ اقوام متحدہ کے سابق سکریٹری جنرل کوفی عنان نے مسئلہ کے حل کے لیے کوششیں کی ہیں تو اسے قبولیت سے سرفراز کردیا گیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ عرب لیگ کے سارے مطالبات مان لیے جاتے، لیکن کم از کم ایسے عملی اشارے تو دیے جاسکتے تھے کہ جس سے مستقبل قریب میں مسئلے کے حل کی امید بندھ جاتی۔ اگر واقعی عرب لیگ کی پہل پر سنجیدگی کے ساتھ اقدامات ہوجاتے تو یقینی طور پر شام میں بہ نام ”مبصرین“ غیروں کا داخلہ روکا جاسکتا تھا۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اب تک علامتی طور پر اقوام متحدہ کے چھ مبصرین شام کی سرحدوں میں داخل ہوچکے ہیں، جب کہ یہ تعداد بڑھ کر ۲۵۰ تک پہنچ جائے گی جس پر حکومتِ شام راضی بھی ہوچکی ہے۔ اطلاعات ایسی بھی ہیں کہ اقوام متحدہ کے موجودہ سکریٹری جنرل بانکی مون اس تعداد میں مزید اضافہ کے لیے اپنے اثر و رسوخ استعمال کر رہے ہیں۔

ان حالات میں بہت ضروری ہے کہ مسلح جنگ جُو بھی مفاہمت کی راہ اپنائیں اور اس

موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے آپسی گفت گو کے ذریعہ اپنے مسائل حل کریں۔ یقین جانیں کہ پورا ملک ایک جسم کی طرح ہوتا ہے کہ جس کے کسی ایک عضو کو بھی نقصان پہنچے تو اسے جزوی نقصان کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ملک کے کسی حصے کی تباہی ہو وہ بہ ہر حال اپنی ہی تباہی کہلائے گی۔ اربابِ اقتدار کو بھی یہ بات ملحوظ رکھنی ہوگی کہ ان کے فوجی تربیت یافتہ ہیں۔ انھیں اچھی طرح اپنے جنرل کے احکامات پر عمل کرنے کا سلیقہ ہے، لہٰذا جیسے ہی اسلحے کو میان میں رکھنے کے پیغامات انھیں دیے جائیں وہ بلا تاخیر ان ہدایات پر عمل کریں گے، لیکن مسلح جنگ جُوؤں سے اس طرح کی امید رکھنا عبث ہے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ ان کے یہاں قائدین کی ایک لمبی چوڑی فہرست ہوگی۔ پھر لڑنے والوں میں فوجی تربیت کے فقدان کی وجہ سے کسی ایک لیڈر کے حکم پر فوری طور سے عمل کرنے کا سلیقہ بھی ان میں کما حقہ نہیں ہوگا۔ ان زمینی حقائق کی روشنی میں ہوسکتا ہے کہ جس طرح حکومتی فوج معاہدے کی پاسداری کرے، ٹھیک اسی طرح کی پابندی اصلاحات کے جذباتی متوالے نہ کرسکیں اور چند سر پھرے کہیں فوج پر حملہ کردیں۔ لہٰذا اربابِ حکومت کو چاہیے کہ ملک کے وسیع تر مفاد میں وہ صبر وضبط کا مظاہرہ کریں اور اسے استثنائی حادثات کے خانے میں ڈال دیں، نیز عجلت پسندی میں اپنے ہم وطنوں کی سرکوبی کے لیے کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں کہ دوسروں کو بولنے کا موقع مل جائے۔

اسی کے ساتھ ملک کے شہری بھی فراخدلی کا مظاہرہ کریں اور اہل حکومت سے گفت گو کے دوران انھیں یقین دلائیں کہ اقتدار سے دست برداری کی صورت میں کسی طرح کی کوئی انتقامی کارروائی ان کے خلاف نہیں کی جائے گی۔ یہ بات اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ اگر مرنے والے کو معلوم ہوجائے کہ اسے بہ ہر حال مرنا ہے تو پھر وہ آسانی سے شکست قبول نہیں کرتا، بل کہ وہ زندگی کے میچ میں آخری گیند تک جیت کی کوششیں کرتا رہتا ہے۔ بہ صورتِ دیگر اسے اگر یہ معلوم ہوجائے کہ دوستانہ ہاتھ بڑھانے کے نتیجے میں اپنی زندگی کی مزید بہاریں وہ دیکھ سکتا ہے تو میرے خیال میں وہ نفسیاتی طور پر مدِ مخالف کے مطالبات قدرے آسانی کے ساتھ قبول کرلے گا۔ پھر اگر ایسا بھی ہوجائے تو کیا حرج کہ اخلاص کے

ساتھ سیاسی اصلاحات کے نافذ کرنے کے عوض اراکین حکومت کو تاحین حیات ایسی مراعات دے دی جائیں کہ وہ پرتعیش زندگی گزار سکیں۔ غور کیجیے کہ کیا یہ ''مراعات'' بڑے پیمانے پر ملک کی تباہی و بربادی کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر نہیں؟ اگر واقعی یہی بہتر ہے تو پھر جنگ جُوؤں کو عوام کے بہتر مفاد کے پیش نظر اربابِ حکومت کو برطانیہ کی شہنشاہیت جیسی پیش کش کردینی چاہیے۔

صاحبو! عالمی سیاسی حالات کے نشیب وفراز پر گہری نگاہ رکھنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں کہ کیا عجب یہی ''غیر جانب دار مبصرین'' آنے والے مستقبل میں شام کی تباہی و بربادی کے لیے دوسروں کے مہرے بن جائیں۔ اس وقت حالات اپنے ہاتھوں سے باہر ہوجائیں گے اور ہزار چاہنے کے باوجود ہم جو چاہیں گے نہ کرسکیں گے، بل کہ وہ جو چاہیں گے کر گزریں گے۔ اے کاش! کوئی شام کے اربابِ اقتدار تک ہم مسلمانوں کی دردناک التجائیں پہنچادے کہ وہ پھر سے عرب لیگ یا او آئی سی سے رابطہ کریں اور اپنوں کی ثالثی میں ہی اپنے اختلافات سلجھالیں تاکہ گھر کی بات گھر تک ہی رہ جائے اور غیروں کو کسی طرح کی مداخلت کا موقع نہ مل سکے۔

خدائی کے دعوے دار خود عبرت کا نشان بن گئے

سر گرافٹن ایلیٹ سمتھ کی تحقیق کے مطابق رعمسیس ثانی کے نام سے موسوم جو ممی شدہ لاش قاہرہ کے عجائب گھر میں رکھی ہے وہ فرعونِ موسیٰ کی ہے

ملکِ مصر سے تاریخ انسانیت کا ایک عبرت ناک باب منسلک ہے کہ اسی سرزمین پر فرعون نے خدائی کا دعوی کیا۔ میں نے وہ فلک بوس اہرام کی عمارت بھی دیکھی جہاں مرنے کے بعد فرعونیوں کی لاشیں رکھی جاتی تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ آں جہانی ہفتہ عشرہ دنوں کے بعد دوبارہ زندہ ہو جائیں گے، لہٰذا ان کی خدمت کے لیے چند افراد بھی ساتھ چھوڑ دیے جاتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ خدام کے لیے چند دنوں کا کھانا رکھا جاتا تھا تاکہ وہ فرعون کی حیاتِ نو تک گزر بسر کر سکیں۔ سوچتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آجاتا ہے کہ لاش کے ساتھ جو خدام چھوڑ دیے جاتے تھے ان کے باہر نکلنے کے سارے راستے آہنی زنجیروں اور وزنی چٹانوں سے مسدود کر دیے جاتے تھے۔ مشہور ہے کہ اہرام کے باقیات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خورونوش کے ختم ہونے کے بعد خدام نے زندہ رہنے کے لیے آپس میں ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیا۔ اب ان میں جو طاقت ور ہوتا وہ کم زور کو کھا لیتا۔ اس طرح ایک ایک کر کے سب مارے گئے اور اخیر میں بچ جانے والا شخص تغذیہ کی کمی کے باعث جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

تاریخ انسانیت کے ماہرین کے لیے اہرام کی وسیع وعریض عمارت بڑی ہی دل چسپی کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال لاکھوں سیاح دنیا کے دور دراز علاقوں سے اسے دیکھنے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ اس قدر وزنی پتھروں کے بڑے بڑے

سِلوں کو کس طرح بلندیوں تک پہنچایا گیا ہوگا؟ کس طرح سے انھیں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کر کے تعمیری حکمتِ عملی طے کی گئی ہوگی؟ پھر کئی ہزار فٹ کی لق ودق عمارت میں یکسانیت برقرار رکھنا آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے عہدِ قدیم میں ہونے والی محیر العقول تعمیرات میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ اہرام کی عالمی شہرت اور سیاحوں کی کثرت سے آمدورفت کے باوجود یہ بات افسوس ناک محسوس ہوئی کہ انتظامیہ نے صفائی ستھرائی کا بہتر انتظام نہیں رکھا ہے۔ راہ داریاں جگہ جگہ سے ٹوٹی پڑی ہیں، دھوپ کی تپش سے حفاظت کے لیے کوئی سائبان نہیں ہے، بل کہ اس سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ کہ کرایے پر گھوڑ سواری کرانے والے آزادی کے ساتھ اپنے جانوروں کو احاطے میں دوڑاتے پھرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان جانوروں کے پیشاب اور لید سے ایک طرف گندگی پھیلتی ہے تو دوسری طرف بدبو سے فضا پوری طرح مکدر ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک دوسری حیرت سے اس وقت دوچار ہونا پڑا جب ہم داخلے کے ٹکٹ لے کر احاطے میں داخل ہوئے۔ اندر جاتے ہی دو افراد ہماری طرف یہ کہتے ہوئے لپکے کہ اپنی ٹکٹ دکھاؤ۔ ہم نے انھیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی تو کہنے لگے کہ یہ دوسرا کاؤنٹر ہے جہاں تفتیش ہوتی ہے۔ ہمارے ساتھ مولانا نورالعلی تھے جو کہ گذشتہ کئی سالوں سے یہاں حصولِ تعلیم کے لیے مقیم ہیں، ان کے لیے یہ شعبدہ بازیاں نئی نہیں تھیں۔ وہ کہنے لگے کہ یہ سب گھوڑ سواریاں کرایے پر دینے کے لیے لوگوں کو اپنے چنگل میں کرنے کی کوششوں کا حصہ ہے۔ یہ لوگ ٹکٹ لے کر آپ کو مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی خدمات حاصل کی جائیں۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ احاطے کے اندر اس طرح کے شعبدہ بازوں کو داخلے کی اجازت کیوں کر دی گئی؟

زمانۂ قدیم کے یہ فرعون خدائی کے دعوے دار تھے۔ قرآنِ مقدس میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان مکالمے، مباحثے اور مشاجرے کا قصہ متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ان واقعات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ فرعون کے نزدیک خدائی کا تصور کس قدر سہل تھا۔ زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے پر اقتدار کا موقع کیا ملا کہ نخوت وکبر کے نشے میں مدہوش ہو گیا اور اپنے پالن ہارِ حقیقی کو فراموش کر کے خود ہی خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا۔ حیرت

ہوتی ہے کہ لوگوں کی عقل وفہم میں اتنی موٹی بات نہ آسکی کہ جو اپنی زندگی کے لیے خود ہی کسی دوسرے کا محتاج ہو وہ لوگوں کی حیات کا مالک کیوں کر ہو سکتا ہے؟

مصر کی قدیم روایات میں ملک کے بادشاہ کا لقب ''فرعون'' ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جس فرعون سے سابقہ پڑا اسے دوسروں سے ممیز کرنے کے لیے ''فرعونِ موسیٰ'' کہا جاتا ہے۔ اللہ نے بنواسرائیل کو فرعون کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اپنی قوم کو لے کر ملک سے باہر نکل جائیں۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر صحرائے سینا کی جانب نکل پڑے۔ جب فرعون کو اس واقعے کا علم ہوا تو اپنے لشکر اور حواریوں کے ساتھ آپ کے تعاقب میں نکل پڑا۔ سامنے سمندر کی لہریں اور پیچھے فرعون کا لشکرِ جرار دیکھ کر بنواسرائیل کے چہروں کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سمندر کی لہروں پر اپنی لاٹھی سے ضرب لگائیں۔ لاٹھی کی ضرب سے سمندر کی اٹھتی ہوئی موجوں کے بیچ شگاف پڑ گیا اور راہ داری بن گئی۔ بنواسرائیل اطمینان وسکون کے ساتھ خراماں خراماں عین سمندر کے بیچ بنے راستے سے گزرنے لگے۔ فرعون بھی تعاقب کرتا ہوا ان کے نقشِ قدم پر اسی راہ داری میں اتر پڑا۔ بنواسرائیل جب بہ خیریت وعافیت سمندر عبور کر چکے اور فرعون ابھی درمیان ہی میں تھا کہ اتنے میں سمندر کی سرکش موجوں نے اسے اپنی گود میں دبوچ لیا۔ اس طرح فرعون غرقاب ہو گیا۔ اللہ رب العزت نے اسی فرعون کے حوالے سے سورۂ یونس میں تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً، وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ۔ (قرآن کریم، سورۂ یونس، آیت: ۹۲)

''آج ہم تمہاری لاش کو خراب ہونے سے بچالیں گے تاکہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے تو نشانِ عبرت بن جائے، بلاشبہ بہت سے لوگ ہماری نشانیوں پر توجہ نہیں دیتے۔'' (فیضان القرآن)

واضح رہے کہ فرعون کی غرقابی کا واقعہ بحر احمر میں واقع ہوا تھا۔ لہٰذا بہت ممکن تھا کہ سمندر کا کھارا پانی فرعون کی لاش کو تیزی کے ساتھ گلا کر ریزہ ریزہ کر دیتا یا بحری جانور اپنے

لیے اسے لقمہ تر بنا لیتے، لیکن اللہ نے سمندر کی آوارہ موجوں پر لگام دیتے ہوئے حکم دیا کہ وہ فرعون کی لاش کو بہ سلامت پہاڑوں کے دامن میں ڈال دے۔ یہی پہاڑ جبلِ فرعون کے نام سے مشہور ہے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ بنواسرائیل نے فرعون کی لاش کو اپنے ماتھے کی آنکھ سے دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ واقعی عہدِ فرعون کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

مصری تہذیب میں لاشوں کو ممی کر دینے کا رواج عام تھا، لہٰذا لوگوں نے فرعون کی لاش کو بھی ممی کر کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ ماہرین آثار قدیمہ نے شاہی قبرستانوں سے کھدائی کے دوران چند ممی شدہ لاشیں نکالی ہیں۔ ۱۹۰۷ء میں سر گرافٹن الیٹ سمتھ کی تحقیق کے مطابق رعمسیس ثانی کے نام سے موسوم جو لاش قاہرہ کے عجائب گھر میں رکھی ہے، وہ اسی فرعون کی ہے جو بحر احمر میں غرقاب ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے موصوف کہتے ہیں کہ جب لاش سے پٹی کھولنے کی کوشش کی گئی تو جسم پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی جو سمندر کے کھارے پانی میں لاش کے غرقاب ہونے کی ایک کھلی ہوئی دلیل ہے۔

صاحبو! اس عبرت ناک واقعہ کے پس پردہ بنیادی محرکات پر غور کریں تو یہ بات دوپہر کی دھوپ کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ فرعون کا ظلم وطغیان اور کفر وجود اس کے ''غرور وتکبر'' کا نتیجہ تھا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے واضح پیغام کی حقانیت کو ماتھے کی آنکھ سے دیکھ کر بھی نخوت وغرور کے نشے میں تسلیم کرنے سے انکار کرتا رہا۔ وہ خدائی کا دعوے دار تھا، لیکن خود اپنا تحفظ کرنے میں ناکام رہا۔ بہت ممکن ہے کوئی اسے ایک سادہ سا حادثہ سمجھ کر پسِ پشت ڈال دے، لیکن دراصل اسی واقعہ کے بین السطور میں ہم سبھوں کے لیے ایک عظیم درس پنہاں ہے کہ غرور وتکبر کے نتیجے میں انسان کے احساساتِ عبدیت کی حدود سے نکل کر معبودیت کی صف میں شامل ہونے لگتے ہیں اور پھر یہیں سے انسان کے زوال کی ابتدا ہو جاتی ہے۔

شکوۂ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

برصغیر پاک و ھند

ملت کی فلاح و بہبود کے لیے پزیرائی تنقید سے کہیں زیادہ مفید

اہلِ مغرب پزیرائی زیادہ کرتے ہیں اور تنقید کبھی کبھی
اور اہلِ مشرق تنقیدیں زیادہ کرتے ہیں اور پزیرائی کبھی کبھی

طے شدہ پروگرام کے مطابق مَیں دبئی ہوتا ہوا ۸ بجے شب دہلی کے اندرا گاندھی انٹرنیشنل ائرپورٹ پر پہنچا۔ حسنِ اتفاق کہ کہرا زیادہ نہیں تھا اس لیے وقت مقررہ پر ہی میری فلائٹ لینڈ کرگئی۔ چوں کہ مجھے دہلی سے ناگ پور کے لیے اسپائز جیٹ کی پرواز میں سفر کرنا تھا جو کہ صبح ساڑھے سات بجے دہلی سے روانہ ہوا کرتی ہے، اس لیے مناسب محسوس ہوا کہ اپنے بھائی سے ملاقات کرلی جائے۔ میں دیر گئے رات تک ان کے دولت کدے پر آ گیا اور علی الصباح ہی پالم ائرپورٹ کے لیے نکل پڑا۔ چوں کہ وقت فجر کی ابتدا سے قبل ہی گھر سے نکلا تھا اس لیے فجر کی نماز گھر میں نہ پڑھ سکا۔ ائرپورٹ پہنچ کر بورڈنگ پاس لی اور معمول کی تفتیش کے مراحل سے گزر کر اب میں انتظار کے لیے بنائے گئے لاونج میں تھا۔ فجر کی نماز کے لیے مَیں نے وضو بنایا اور جہتِ قبلہ معلوم کرنے کے لیے سمت کے تعین کے حوالے سے کئی دکان کے مالکوں سے استفسار کیا۔ اسی دوران ایک صاحب نے بتایا کہ آپ داہنی طرف کی راہ داری سے متصل پریئر ہال میں چلے جائیں وہاں آپ کسی سے پوچھ لیجیے گا۔ دل میں خیال گزرا کہ شاید یہاں کی انتظامیہ نے ہندو مذہب کے مطابق عبادت کے لیے کوئی جگہ مخصوص کی ہوگی جس کی جانب اشارہ کیا جارہا ہے۔ بہ ہرکیف نہ چاہتے ہوئے بھی بوجھل قدموں کے ساتھ میں اس جانب چل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کمرے کے باہر پریئر ہال کی تختی آویزاں تھی۔ ساتھ ہی دروازے سے متصل جوتے رکھنے کے لیے

الماری رکھی تھی، جس پر لکھا تھا کہ جوتے پہن کر اندر داخل نہ ہوں۔ میں نے اپنے جوتے اتارے اور جوں ہی ہال میں داخل ہوا حیرت واستعجاب سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ زبان پر حمد وتشکر کے کلمات خود بہ خود جاری ہوگئے اور پلکوں کا دامن بھیگ گیا۔ میں نے دیکھا کہ سلیقے سے خوب صورت قالین بچھی ہوئی ہے۔ ایک جانب چھوٹی سی الماری میں قرآن کریم کے چند نسخے اور دعاؤں کی بعض کتابیں رکھی ہیں۔ الماری کے نچلے خانے میں چند جائے نماز سجے ہوئے ہیں اور سامنے کی دیوار پر جہت قبلہ کی تعیین کے لیے علامت منقش کردی گئی ہے۔ مَیں حیران و ششدر تھا کہ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں مسلمانوں کے لیے نماز پڑھنے کی سہولت کا اہتمام اور وہ بھی ائرپورٹ پر! ہاں اگر مسلم ممالک کے ائرپورٹ پر کوئی حصہ مسجد کے لیے مخصوص کردیا گیا ہوتو حیرت کی کوئی بات نہیں کہ وہاں کی اکثریت بھی مسلمان ہے اور حکومت بھی، لیکن یہاں تو مسلمان اقلیت میں ہیں اور اقلیت کا اس قدر خیال۔ بہ ہرکیف مَیں نے فجر کی نماز شروع کی۔ کچھ دیر کے بعد ایک دوسرے نوجوان بھی شامل ہوگئے اور جماعت بن گئی۔

مَیں نماز ختم کرکے باہر نکلا اور دل کی سرگوشی پر انتظامیہ کے بوتھ پر پہنچ گیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ایئرپورٹ کے نظم ونسق کے حوالے سے مجھے کلماتِ تحسین انتظامیہ تک پہنچانے ہیں، لہٰذا مجھے فارم دے دیں۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے نوجوان کے چہرے پر حیرت و استعجاب کے آثار نظر آنے لگے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ بات صحیح ہے کہ عام طور پر لوگ اپنی شکایات پہنچانے کے لیے فارم پر کیا کرتے ہیں، لیکن جو خوشی آج مجھے میسر آئی ہے مَیں چاہتا ہوں کہ اس میں انھیں بھی شریک کروں جن کی کاوشیں آج میری خوشی کا باعث بنی ہیں۔ وہ پوچھ بیٹھا کہ کس امر کے لیے آپ انتظامیہ کی پزیرائی کرنا چاہتے ہیں۔ مَیں نے جواب دیتے ہوئے حقیقت بتادی۔ پھر اسی کی ہدایت پر میں ہال کے کنارے ایستادہ ایک ایسے کمپیوٹر کے قریب جاپہنچا جو مسافرین کی شکایات درج کرنے کے لیے موجود ہے۔ ضروری معلومات کے اندراج کرنے کے بعد میں نے ان کا شکریہ ادا کردیا۔

اللہ گواہ ہے کہ میری اس روداد سے پابندیِ نماز کی تشہیر مقصود نہیں، بل کہ اس پس منظر

میں ایک پیغام ہے جو آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تنقید اسی وقت بھلی لگتی ہے جب انسان کسی اچھی بات پر پزیرائی بھی کرے۔ زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کرنا اور سہولتوں پر خاموشی اختیار کیے رہنا عدل وانصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ جو انسان کسی اچھی بات کی پزیرائی کرتے رہے اور پھر کبھی کوئی خامی دیکھ کر اپنی ناراضگی کا اظہار کر بیٹھے تو منطقی طور پر جس طرح اس کی دی ہوئی پزیرائی کو اہمیت دی جاتی ہے، ٹھیک اسی طرح اس کے ذریعہ کیا ہوا احتجاج بھی قابل قدر سمجھا جاتا ہے۔

یہ ایک مثال ضرور ہے، لیکن اس پس منظر میں ہم اپنے شب وروز کا جائزہ لیں تو یہ بات دوپہر کی دھوپ کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ بعض مستثنیات کے ساتھ ہماری عام روش بھی کچھ اسی طرح ہے کہ ہم احتجاج وتنقید کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، جب کہ اچھے کاموں کی پزیرائی کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی۔ ہماری عادت کا یہ پہلو ہر محاذ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنے خاندان کے درمیان ہوں تو بھی عموماً ہم اسی وقت اپنی زبان کھولتے ہیں جب کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے، اسی طرح اپنے حلقۂ ملازمت میں بھی تنبیہ کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور پھر جب غیروں کے ساتھ معاملات کے حوالے سے کوئی تکلیف دہ صورت حال سامنے آتی ہے تو بھی ہم صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

مشاہدات وتجربات بتاتے ہیں کہ یہ روش کسی بھی قوم کے لیے کبھی بھی سودمند نہیں رہی ہے، جب کہ وہ قومیں جو چھوٹے سے چھوٹے اچھے کاموں پر پزیرائی کا جذبہ رکھتی ہیں، وہ نہ صرف کامیابیوں کے منازل طے کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، بل کہ دوسرے کی نگاہوں میں انھیں ہر دل عزیز ہونے کے مواقع بھی میسر آتے ہیں۔

مغربی دنیا اور مشرقی دنیا میں ایک واضح فرق جسے ماتھے کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ اہل مغرب پزیرائی زیادہ کرتے ہیں اور تنقید کبھی کبھی، اور اہل مشرق تنقیدیں زیادہ کرتے ہیں اور پزیرائی کبھی کبھی۔ اہل مغرب کی یہ عادت ہر محاذ پر دیکھی جا سکتی ہے۔ خواہ سہولت کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، وہ شکریہ کے الفاظ سے ضرور نوازتے ہیں۔ کسی نے دروازہ کھول دیا اور پزیرائی کے الفاظ نوکِ زبان پر، کسی نے راستہ بتا دیا اور کلماتِ تحسین

فضا میں بلند۔

صاحبو! ویسے تو ہمیشہ پزیرائی اور ستائش کے نتائج خوش گوار ہی ہوا کرتے ہیں، لیکن ان ممالک میں اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے جہاں مسلمان اقلیت میں رہ رہے ہیں۔ اس لیے یہ خیال رہے کہ اگر کسی زیادتی پر ہم اپنے احتجاج پس پشت ڈال دیں تو شاید یہ اتنا بڑا ملی نقصان نہیں، جتنا بڑا نقصان کسی اچھے اقدام پر پزیرائی کے ترک کرنے میں ہے۔ اس لیے میری تمام مسلمانوں سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ جب کبھی آپ پالم ایئر پورٹ سے کسی پرواز پر سفر کر رہے ہوں تو وقت نکال کر اپنے کلماتِ تحسین ضرور رجسٹرڈ کروائیں۔

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

گھر میں نہ آنے دینا بے عزتی ضرور ہے،
لیکن آنے کے بعد کھدیڑ دیا جانا بہت بڑی بے عزتی ہے

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ کے ساتھ گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کا نام کچھ اس طرح چسپاں ہو گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم سے ہو گئے ہیں، بل کہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کی شخصیت کے ساتھ جڑا ہوا یہ بدنما داغ اس قدر گہرا ہے کہ اس سے جان چھڑانے کی جو بھی تدبیریں عمل میں لائی جاتی ہیں وہ سب کی سب الٹی ہی ثابت ہو رہی ہیں۔ ماضی کی سیاسی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی فکر سے ہم آہنگ احباب کے ایک طبقے نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ انھیں ہندوستان میں ''بہترین انسان'' ثابت کر دے، لیکن جب یہ حسرت پوری نہ ہوئی تو خواہش نے کروٹ بدلی اور ایک ٹولہ اس شوق میں پوری تن دہی کے ساتھ جٹ گیا کہ پوری دنیا کے سامنے انھیں ہندوستان کے کام یاب ترین وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے پیش کرے۔ چناں چہ حالیہ ٹائم میگزین کے ایشائی شمارے کے ٹائٹل صفحے پر بڑی سی نریندر مودی کی تصویر اسی سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس تصویر کے نیچے جلی حرفوں میں جو عبارت لکھی ہے وہ یہ ہے:

"Modi means business."

اور پھر اس حوالے سے بڑے بڑے بلند بانگ دعوے کیے گئے ہیں۔ صوبے کے ترقیاتی منصوبوں کی جھلک پیش کی گئی ہے اور مستقبل میں اسے مزید نکھارنے کی کوششوں کی جانب اشارہ بھی ہے۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ ٹائم میگزین کے ذریعہ دنیا کے سو

پسندیدہ شخصیات کے انتخاب کا مرحلہ آ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ ''حکمت عملی'' وضع کرنے والوں نے نہایت ہی دانش مندی کے ساتھ ایسے وقت میں ان کے حوالے سے ٹائم میگزین میں تحسین و آفرین کے کلمات لکھے ہیں کہ اس سے عالمی پسندیدہ شخصیات کے انتخاب کا مرحلہ قریب سے قریب تر رہے۔ لیکن ان ساری جدوجہد، محنت و مشقت اور کاوش و جاں فشانی کا نتیجہ جو نکلا وہ مزید ذلت و رسوائی کا باعث بنا۔ کئی دنوں تک وہ عالمی پسندیدہ شخصیات کی درجہ بندی میں سرفہرست رہنے کے بعد منہ کے بل گر پڑے۔ رپورٹ کے مطابق ان کی حمایت میں ۲۵۶۷۹۲ ووٹ پڑے اور مخالفت میں ۲۶۶۶۸۴ ووٹ ڈالے گئے۔ اس طرح وہ آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے رہ گئے اور یہ شعر صدفی صادق آ گیا کہ

قسمت کی بات دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

عالمی سطح پر نریندر مودی کی یہ کوئی پہلی رسوائی نہیں ہے، بل کہ اس سے قبل بھی وہ کئی بار اس مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں امریکہ میں بسنے والے گجراتی تاجرین کی جانب سے انھیں ایک پروگرام میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن نہ صرف یہ کہ وہ اس پروگرام میں شرکت سے روک دیے گئے، بل کہ پہلے سے جو امریکی سیاسی ویزہ ان کے پاسپورٹ پر لگا ہوا تھا وہ بھی منسوخ کر دیا گیا۔ بلاشبہہ یہ ۲۰۰۲ء میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں مسلمانوں کی منظم نسل کشی پر حقوقِ انسانی کی تنظیموں کے غم و غصہ کا اظہار تھا، جس میں تقریباً ۱۱۸۰ مسلمان لقمۂ اجل بن گئے اور ہزاروں مسلم گھر اجڑ گئے تھے۔ بات اکثریتی فرقہ کی طرف سے ہونے والی ظلم و زیادتی کی ہوتی تو مسئلہ اس قدر افسوس ناک نہ ہوتا جتنا یہ سن کر ہوا کہ صوبے کی نمائندہ حکومت نے نہ صرف ''خاموش تماشائی'' بنے رہنے کی پالیسی پر عمل کیا بل کہ عوامی اطلاعات کے مطابق کہیں کہیں قانون کے پاسبانوں نے امن و سکون غارت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

یہی نہیں بل کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اٹل بہاری باجپئی کے دورِ حکومت میں جب دنیا بھر سے آئے ہوئے غیر مقیم ہندوستانیوں **NRI** کی نئی دہلی میں کانفرنس ہو رہی تھی، اس

وقت نریندر مودی نے بھی شرکت کی تھی۔ دورانِ کانفرنس ہی بھرے مجمعے میں ایک ہندو غیر مقیم ہندوستانی کھڑی ہوئی اور اس نے منہ پر یہ کہہ دیا کہ آپ کے رویے سے غیر ممالک میں ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ آپ کی حکومت نے گجرات کے ہونے والے فرقہ وارانہ فساد میں جس قسم کی پالیسی اپنائی ہے وہ کسی بھی جمہوری ملک کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ہم غیر ممالک میں فخر سے کہتے نہیں تھکتے کہ ہندوستان کو برصغیر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہاں سینکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں، مختلف مذاہب کے لوگ آزادی کے ساتھ اپنے اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارتے ہیں اور رنگ برنگی تہذیب وتمدن کے ساتھ وہ اپنے آپ میں ایک چھوٹی سی دنیا ہے۔ لیکن جب اس طرح کے افسوس ناک واقعات ظہور پذیر ہوجاتے ہیں تو ہمیں جواب دینا مشکل ہوجاتا ہے۔

اور اسی سلسلے کی ایک حالیہ کڑی وہ بھی ہے کہ جس میں امریکی کانگریس کے رکن جو واش نے وزیر خارجہ ہلری کلنٹن سے درخواست کی تھی کہ ۲۰۰۵ء میں حکومت امریکہ کی طرف سے نریندر مودی کے ویزے کی منسوخی کا جو فیصلہ کیا گیا تھا اسے واپس لے لینا چاہیے تاکہ امریکہ میں رہنے والی گجراتی برادری کے پروگرام میں وہ شرکت کرسکیں۔ اس درخواست کے جواب میں وزارتِ خارجہ کی ترجمان وکٹوریہ نولانڈ نے بڑا ہی واضح جواب دیا کہ حکومت امریکہ نریندر مودی کو ویزہ نہ دینے کے اپنے پرانے فیصلے پر آج بھی قائم ہے۔ ایسی اطلاعات بھی موصول ہورہی ہیں کہ گجرات سے تعلق رکھنے والے تجارت پیشہ افراد ہر سال کسی نہ کسی بہانے نریندر مودی کو امریکہ میں مدعو کرتے رہتے ہیں، لیکن ویزہ نہ ہونے کی وجہ سے انٹرنیٹ کے سہارے ہی شرکت پر انھیں قناعت کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ہر سال دعوت دیے جانے کے بعد ہزیمت سے دوچار ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ پورے نارتھ امریکہ میں متوسط درجے کے زیادہ تر رہائشی ہوٹل گجرات کے رہنے والے ہندوؤں کے زیر اہتمام ہیں۔ اس طرح تجارتی میدان میں گجرات کے رہنے والے امریکہ میں چھائے ہوئے ہیں۔

صاحبو! آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹائم میگزین میں دنیا کی ممکنہ پسندیدہ شخصیات کی

فہرست میں نریندر مودی کا نام ہونا ہی نہیں چاہیے، لیکن مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر اس فہرست میں ان کا نام نہ ہوتا تو کسی طرح اسے بے عزتی کے خانے میں رکھا نہیں جاسکتا تھا، لیکن ممکنہ فہرست میں جگہ پانے کے بعد ہزیمت کا شکار ہوجانا بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی کو گھر میں بلا کر کھدیڑ دیا جائے۔

اسی طرح گجرات کے لوگ اپنے پروگراموں میں انھیں دعوت نہ دیں تو یہ کوئی بے عزتی کی بات نہیں، لیکن ہر سال ان کے استقبال کی ہزار تیاریوں کے باوجود ان کی عدم شرکت یقیناً انھیں کچوکے دیتی ہوگی۔ کہنے دیا جائے کہ جس قدر لوگ انھیں بلند کرنے کی کوششیں کریں اسی قدر ہزیمت کے بعد انھیں سبکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور یہی حقوقِ انسانی کی حمایت کرنے والوں کے حق میں بہتر بھی ہے۔ اس طرح کی ذلت ورسوائی کے واقعات کے بعد ان تمام لوگوں تک ایک خاموش پیغام یہ پہنچ جاتا ہے کہ فرقہ پرستی کبھی بھی کسی کو حقیقی توقیر وعزت سے سرفراز نہیں کرسکتی۔ یہ وہ داغ ہے کہ جسے جس قدر دھلا جائے وہ اسی قدر مزید گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ جان کی امان ملے تو کہوں کہ ٹائم میگزین کے سرورق پر نمایاں تصویر کے نیچے جو عبارت لکھی ہے اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صنعت وحرفت، تجارت وترقی اور اقتصادی پس منظر سے دیکھا جائے تو نریندر مودی ایک ''اچھے وزیر اعلیٰ'' ہیں، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ایک ''اچھے انسان'' بھی ہیں۔ اس لیے کہ اقتصادی ترقی کے زاویہ نگاہ سے اچھا وزیر اعلیٰ ہونا اور ہے، اور عدل وانصاف، امن وتحفظ اور غیر جانب داری کے زاویہ نگاہ سے لوگوں کے لیے اچھا انسان ہونا اور ہے۔ عقل و فراست رکھنے والوں کے لیے دونوں حیثیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے کہ تاریخ انسانی میں وہ لوگ تحسین آمیز کلمات سے ہمیشہ یاد کیے جاتے ہیں جو لوگوں کے ''دلوں'' پر حکومت کرتے ہیں اور وہ لوگ معدودے چند سالوں کے بعد بھلا دیے جاتے ہیں جو ''قطعہ زمین'' پر حکومت کرتے ہیں۔

سیاچن میں تعینات فوج فطرت کے خلاف مصروفِ جنگ

گذشتہ آٹھ سالوں سے دونوں طرف کی فوجوں کے درمیان ایک گولی کا بھی تبادلہ نہ ہوا لیکن قدرتی آفات سے محاذ آرائی بہ ہر حال رہی

۷/اپریل ۲۰۱۲ء کا دن ایک خوف ناک حادثے کی حیثیت سے فوجی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، جب کہ پاکستان کی گیاری فوجی چوکی ایک کیلومیٹر رقبے اور ۶۰ سے ۸۰ فٹ موٹے برفانی تودے کی زد میں آگئی۔ یہ فوجی چوکی سطح سمندر سے ۵۷۵۰ سے لے کر ۶۲۰۳ میٹر تک بلند ہے، جسے دنیا میں سب سے اونچا میدانِ جنگ بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں کا درجہ حرارت منفی ۶۰ ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ کتنی خطرناک جگہ ہے، اس کا اندازہ جنرل خلیل محمود عارف ریٹائرڈ چیف آف آرمی پاکستان کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی غلطی سے کسی پتلے برفیلے پرت پر قدم رکھ دے تو وہ ۲۰۰ فٹ تک نیچے دھنس سکتا ہے اور اس کی متاعِ حیات ہمیشہ کے لیے گم ہوسکتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ۱۹۸۴ء سے قبل سیاچن کے علاقے میں ہند و پاک میں سے کسی کی بھی مستقل فوجی چوکیاں نہ تھیں۔ آپسی تعلقات کی کشیدگی نے دونوں ممالک کو ہمہ وقتی فوجی چوکیاں قائم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس وقت سے آج تک یہاں پر مسلح فوجیں ہمہ وقت تعینات رہتی ہیں۔ یہ بڑی ہی عجیب بات ہے کہ یہاں کی فوجی چوکیوں کا حاصل کیا ہے، یہ تو کوئی نہیں جانتا لیکن ان کی وجہ سے ہونے والے نقصانات سے سبھی واقف ہیں۔ اب یہی دیکھیے کہ ہند و پاک جیسے ممالک میں جہاں لاکھوں افراد کے سروں پر چھت نام کی چیز نہیں اور مسلسل فاقہ کشی سے آئے دن زندگی کے چراغ گل ہوتے ہوں، یہاں پر فوجی کیمپ قائم

رکھنے کے لیے بھاری رقم خرچ کرتے ہیں۔

فوجی اخراجات کا تخمینہ لگانے والے ماہرین کہتے ہیں کہ ایک محدود اندازے کے مطابق پاکستان ۶۰ ملین ڈالر اور ہندوستان تقریباً ۲۰۰ ملین ڈالر سالانہ خرچ کرتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اگر یہی دولت انسانی فلاح و بہبودی پر خرچ کی جائے تو کئی ویرانے آبادیوں میں تبدیل ہوسکتے ہیں اور جہالت و پستی میں ڈوبے ہوئے لاکھوں بچوں کو علم و آگہی کے اجالے میں لایا جاسکتا ہے۔

اچھا، بات صرف بے جا صرفے ہی کی نہیں ہے، بل کہ یہاں پر تعینات فوجی کیمپ کی وجہ سے جغرافیائی حالات کی تبدیلی کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات پر بھی نگاہ ڈالیں تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ پاکستان میں منصوبہ ساز پالیسی ادارے سے تعلق رکھنے والے فیصل ندیم گوچانی کے مطابق گذشتہ ۳۵ سالوں میں تقریباً ۱۰ کیلومیٹر گلیشیر سکڑ گیا ہے، جب کہ ایک دوسرے پاکستانی ادارے کی تحقیق کے مطابق ۱۹۸۴ء سے اب تک ۳۰٪ گلیشیر پگھل گیا ہے۔

اسی طرح ہندوستان کے جغرافیائی حالات پر گہری نظر رکھنے والے کیمکار کے مطابق ہندوستانی حصے میں موجود فوجی کیمپ کی وجہ سے تقریباً ۹۰۰ کیلو غلاظت پیدا ہوتی ہے جو کہ **Indus** ندی میں چلی جاتی ہے۔ یہی حال پاکستانی حصے میں تعینات فوجیوں کے ذریعہ ہونے والی غلاظت کا ہے جو بالآخر اسی ندی میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ دونوں جانب رہنے والی انسانی آبادیوں کی آبی ضروریات کا انحصار اسی ندی پر ہے۔ ہوسکے تو اندازہ لگائیں کہ گندگی سے پانی کے متاثر ہونے کے وجہ سے کس قدر مضر اثرات انسانی جسم پر مرتب ہوتے ہوں گے؟ صرف اتنا ہی نہیں بل کہ تحفظ حیوانات کے ماہرین کے مطابق تیزی کے ساتھ گلیشیر کے پگھلنے کی وجہ سے ان جانوروں کی زندگی کے لیے بھی خطرات پیدا ہوگئے ہیں جو برف میں رہنے کے عادی ہیں۔ ان میں برفیلا شیر، براؤن بیئر اور ایک نادر قسم کی جنگلی بکری جسے **Ibex** کہا جاتا ہے، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اب ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر انسانی جانوں کے تلف ہونے کے افسوس ناک حادثات پر بھی نگاہ

ڈالیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۹۹۹ء-۱۹۸۴ء کے درمیان تقریباً ۱۳۰۰ پاکستانی فوجی خراب موسم سے نبرد آزما رہتے ہوئے انتقال کر گئے۔ اسی طرح ۱۹۹۷-۱۹۸۴ء کے درمیان تقریباً ۲۰۰۰ ہندوستانی فوجی مختلف قسم کے حادثات کا شکار ہوئے۔ ایک دوسری رپورٹ کے مطابق کسی زمانے میں ایسا بھی تھا کہ ہر چار دنوں میں ایک پاکستانی فوجی انتقال کرتا تھا اور ہر دوسرے دن ایک ہندوستانی فوجی موت کے منہ میں چلا جاتا تھا۔

حقائق بہ ہر کیف جو بھی ہوں لیکن اس قدر تو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ سیاچن کے علاقے میں فوجوں کو ایک دوسرے سے اتنا نقصان نہیں پہنچا ہے جتنا کہ قدرتی آفات اور موسم کی خرابی سے پہنچا ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ گذشتہ آٹھ سالوں سے دونوں طرف کے فوجیوں کے درمیان ایک گولی کا بھی تبادلہ نہیں ہوا ہے، لیکن اس درمیان سینکڑوں انسانوں کی زندگی کا چراغ صرف موسم کی سختیوں کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ اس لیے یہ کہنا حالات کی صحیح ترجمانی ہوگی کہ سیاچن پر تعینات فوجی چوکیاں ایک دوسرے سے نبرد آزما نہیں ہیں، بل کہ فطرت سے جنگ میں مصروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک امریکی ماہر جناب نیل کیمکار کہتے ہیں کہ

"The world's biggest and highest garbage dump" *(Stanford Environmental Law Journal)*

یعنی دنیا کا سب سے عظیم اور سب سے زیادہ بلندی پر مشکلات کی آماج گاہ۔

آپ مانیں یا نہ مانیں حالات کے جائزہ کے بعد ان کا یہ تجزیہ صد فی صد درست دکھائی دیتا ہے۔ اس قدر جانی تلف، مالی خسارہ، جغرافیائی نقصانات اور حیوانی نسل کو ہونے والے خطرات کے باوجود آخر ہونے والا فائدہ بھی تو کوئی بتائے۔ کوئی تو کہے کہ آسمان کی بلندیوں پر ہونے والی ہول ناکیوں، سختیوں اور بے پناہ مشکلات کے برداشت کرنے کا حاصل کیا ہے؟ جب کہ دونوں ملکوں میں پھیلے ہوئے کروڑوں انسان ایسے ضرور مل جائیں گے جو یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ سیاچن پر فوجی چوکیوں کے نتیجے میں پہنچنے والے نقصانات تصور سے زیادہ ہیں۔

صاحبو! آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ دونوں ملکوں کے درمیان سیاسی رقابت کی سزا بے چارے فوجیوں کو پہنچ رہی ہے۔ ان کا قصور صرف اس قدر ہے کہ وہ ملکی فوج کا حصہ ہیں اور انھیں ضابطے کے مطابق بہ ہر حال صادر ہونے والے احکامات پر عمل کرنا ہے۔ اسے انسانیت نہیں کہتے کہ دوسروں کی تکالیف کا ذرا احساس ہمیں نہ ہو۔ کسی نے بڑی پیاری بات کہی کہ پاکستان میں اتنی بڑی تباہی و بربادی کے باوجود ایسا نہیں لگتا کہ حکومت سیاچن پر اپنی فوجی چوکی ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا اعلان کردے۔ یہ اس لیے کہ وہاں جلد ہی انتخابات ہونے والے ہیں اور حکومت کو خطرہ ہے کہ اس کے مخالفین کہیں اسے قومی پسپائی بنا کر لوگوں کے سامنے پیش نہ کردیں۔ دل لگتی بات کہوں کہ ارباب حکومت کو کیا پڑی ہے کہ دور افتادہ پرخطر علاقے میں پڑے ہوئے فوجیوں کے حالات پر انھیں تکلیف کا احساس ہو۔ ہاں اگر خود ان کے اپنے لاڈلے سیاچن کے فوجی کیمپ کا حصہ ہوتے تو یہ معاملہ کب کا رفع دفع ہو چکا ہوتا۔ اس لیے کہنے دیا جائے کہ اگر دونوں ممالک کے سنجیدہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سیاچن سے فوجی کیمپ ہمیشہ کے لیے ختم کردیا جائے تو اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے وطن میں اس بات کی تحریک چھیڑ دیں کہ ارباب اقتدار اپنے لاڈلوں کو اس فوجی کیمپ میں تعینات کریں۔ یقین جانیں جو مسئلہ بیسیوں سالوں میں حل نہ ہو سکا وہ مہینوں میں نہیں بل کہ چند ہفتوں میں حل ہو جائے گا۔

ہندوستان کے مسلمان سیاسی طور پر مستحکم ہو رہے ہیں

سیاسی پارٹیوں سے مطالبات کرتے ہوئے لب ولہجہ ایسا نہ ہو کہ اکثریتی طبقہ ان پارٹیوں سے منہ پھیر لے

مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ آزادی کے بعد سے لے کر آج تک ہندوستان میں سیاسی طور پر مسلمان کبھی بھی اس قدر طاقت ور نہیں تھا جتنا کچھ عرصے سے دکھائی دے رہا ہے۔ ماضی میں مسلمانوں کی اکثریت ہمیشہ سے کانگریس کے ساتھ رہی اور ہر حال میں اپنا قیمتی ووٹ اسے ہی دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ حسن سلوک نہیں کیا، بل کہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جس کشادہ دلی کے ساتھ ہندی مسلمان کانگریس کی حمایت ونصرت میں پیش پیش رہے، انھیں اس کے مقابلے میں حکومت کی جانب سے وہ توقیر وعزت نہ ملی جو ملنی چاہیے تھی۔ بہ ہر کیف اب جب کہ علم و آگہی کی روشنی تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے اور سب کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی فکر و نظر کے زاویے بدل رہے ہیں تو اس کا بہ راہِ راست نتیجہ یہ نکلا کہ اب مسلمان کسی ایک سیاسی پارٹی کے ہاتھوں اپنے مستقبل کا سودا نہیں کرنا چاہتے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ملی اعتبار سے یہ بہت بڑا فکری انقلاب ہے۔ اس طرز عمل کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر آنے والے انتخاب سے پہلے ہندوستان کی دیگر قوموں کی طرح مسلمان بھی سیاسی پارٹیوں کی عملی کارکردگی کی روشنی میں ہی اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔

اب دیکھیے کہ بہار میں نتیش کمار جس محیر العقول کام یابی کے ساتھ دوسری مدت کے لیے منتخب کیے گئے ہیں، اس میں مسلمانوں کی حمایت کا بہت بڑا دخل ہے۔ سیاسی امور پر عقابی نگاہ رکھنے والوں نے بہ بانگِ دہل یہ اعتراف کیا ہے سابقہ انتخاب میں مسلمانوں کی اکثریت نے نتیش کمار کے بی جے پی سے قربت کے باوجود محض ان کی کارکردگی کے پیش

نظر انھیں ووٹ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ حکومت جس قدر اب مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے حوالے سے سنجیدہ دکھائی دے رہی ہے اس قدر پہلے نہ تھی۔ ابھی حال ہی میں پیشگی اطلاع دیے بغیر کرناٹک پولیس کے ذریعہ چناسوامی اسٹیڈیم میں ہونے والے دھماکے کے معاملے میں دربھنگہ سے کفیل احمد کی گرفتاری پر نتیش کمار کا احتجاج بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

اسی طرح بنگال میں بھی ترنمول کانگریس کی واضح کام یابی میں مسلمانوں کی حمایت و نصرت کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ یہ اسی اجتماعی حمایت کا اثر تھا کہ ممتا بنرجی نے بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا اور مدارس اسلامیہ کے استحکام کے لیے بھی مثبت پالیسی کا اعلان کیا۔ ابھی چند ہفتوں قبل ممتا بنرجی نے صوبہ بنگال کے ائمہ مساجد کے لیے جن نوازشات کی خواہش کا اظہار کیا ہے وہ اپنے آپ میں ایک انوکھی مثال کہی جائے تو بے جا نہ ہو۔ وہ بات جو کسی کے حاشیہ ذہن میں نہ تھی اس شیر دل عورت نے بلا خوفِ لومتِ لائم کہہ دی۔ یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں کہ صوبے کی وزیر اعلیٰ نے ائمہ مساجد کے لیے وقف جائداد کی آمدنی سے وظائف اور ساتھ ہی ساتھ انھیں رہائش کے لیے پلاٹ دینے، نیز مکان بنانے کے لیے بھی ہر طرح کی سہولت فراہم کرنے کا یقین دلایا ہے۔ ابھی تو زمامِ حکومت سنبھالے زیادہ دن نہیں گزرے ہیں، لیکن یہ عزم وحوصلہ ہی مسلمانوں کے حالات میں کسی بڑی انقلابی تبدیلی کا پتہ دے رہا ہے۔ چوں کہ اقتدار میں رہنے والی پارٹیاں عموماً نئے آنے والے الیکشن سے کچھ دیر قبل ہی خواب سے بیدار ہوتی ہیں اور لبھانے والے نت نئے منصوبے عوام کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، اس لیے اگر ممتا بنرجی ابھی سے اپنے کیے ہوئے وعدے کے وفا کرنے کی روایت قائم کر رہی ہیں تو ہمیں ان کے کام کی پزیرائی بھی کرنی چاہیے اور ان کا شکر گزار بھی ہونا چاہیے۔

اب ذرا اتر پردیش پر بھی نگاہ ڈالتے چلیے۔ یہاں کا حال تو سابقہ دونوں صوبوں سے خاصا مختلف ہے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ جیتنے والی پارٹی نے مسلمانوں کی حمایت وتعاون کے ذریعہ اقتدار تک پہنچنے کی حقیقت تسلیم کر لی ہے، بل کہ ہارنے والی بہوجن سماج پارٹی کی

لیڈر مایاوتی نے بھی یہ اعتراف کیا کہ مسلمانوں کے تعاون کا فقدان ہی ان کی شرمناک ہزیمت کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

انتخاب میں حیرت انگیز فتح ونصرت سے ہمکنار ہونے کے بعد سماج وادی پارٹی کے لیڈر ملائم سنگھ کا خود شاہی امام احمد بخاری سے ملاقات کر کے ان کا شکریہ ادا کرنا بھی اسی ناقابلِ انکار حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایم ایل سی کی سیٹ کے لیے آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کو موقع نہ دیے جانے پر جب امام احمد بخاری نے احتجاج کیا تو اسے نہ صرف ملائم سنگھ یادو نے سنجیدگی سے لیا بل کہ اس کے تدارک کے لیے باقاعدہ احمد بخاری کو لکھنؤ مدعو کیا گیا اور توجہ کے ساتھ ان کے مطالبات سنے بھی گئے۔ مسلمانوں کے سیاسی طور پر مضبوط ہونے کی وجہ سے ہی ریاست کے پرعزم وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے بھی مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے سنجیدہ کوششیں شروع کردی ہیں۔ موجودہ اقدامات کو دیکھتے ہوئے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ آنے والے دنوں میں مسلمانوں کے حالات میں نمایاں تبدیلی محسوس کی جائے گی۔

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ اتر پردیش کے سابقہ انتخاب میں کانگریس کے جواں سال لیڈر راہول گاندھی نے بڑی تگ ودو کی۔ وہ مہینوں یوپی کے علاقوں میں خیمہ زن رہے۔ ایک ایک دن میں کئی کئی مقامات پر پہنچ کر تقریریں کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس درمیان وہ شہروں کے علاوہ پس ماندہ دیہاتوں میں بھی گئے اور لوگوں سے دردمندانہ درخواست کی کہ وہ آنے والے انتخاب میں کانگریس کی جیت یقینی بنائیں۔ بہرکیف جو کانگریس کا حشر ہوا وہ سب پر آفتاب نیم روز کی طرح روشن ہے۔

بات بہت دور نکل گئی، میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ الیکشن کے بعد راہول گاندھی نے شکست کے اسباب تلاش کرنے کے لیے ایک پینل تشکیل دیا تھا۔ جس میں شیلا دکشت کے ساتھ ساتھ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر شریک رہے۔ ابھی حال ہی میں اس کمیشن نے جو رپورٹ پیش کی ہے وہ ہم مسلمانوں کے لیے چشم کشا ہے۔

رپورٹ کے مطابق گذشتہ انتخاب میں کانگریس کی شکست کی بڑی وجہ بالواسطہ طور پر

مسلمان ہی ہیں۔ پینل کے اراکین کے بقول انتخاب کے دوران بعض کانگریسی لیڈروں کا مسلمانوں کو لبھانے کے حوالے سے غیر ذمہ دارانہ بیانات اکثریتی فرقے کی کانگریس سے ناراضگی کا باعث بنا، جس کے نتیجے کے طور پر پارٹی بڑے فرق سے ہزیمت کا شکار ہوگئی۔

صاحبو! ان زمینی حقائق کے پس منظر میں یہ کہنا بجا ہے کہ مسلمان اب ہندوستان میں سیاسی طور پر مستحکم ہو رہے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں نے یہ پوری طرح محسوس کرلیا ہے کہ اگر ملک کے مسلمانوں کا یک طرفہ ووٹ ان کے حق میں پڑ گیا تو اقتدار کہیں زیادہ آسانی کے ساتھ انھیں حاصل ہوسکتا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مسلمان غیروں کے ذریعہ اپنی موجودہ تسلیم شدہ اہمیت کو نہ صرف برقرار رکھیں بل کہ اس میں مزید اضافہ کرنے کی تگ ودو میں رہیں۔ میری ناقص سمجھ میں یہ اہم مقصد دو بنیادی پالیسیوں کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے:

۱- مسلمان کسی قیمت پر یہ ثابت نہ ہونے دیں کہ ہم ہر حال میں کسی ایک پارٹی کے غلام بن کر رہیں گے، بل کہ ہر آنے والے الیکشن سے قبل سیاسی پارٹیوں کی کارکردگی کا جائزہ لے کر ہی ہم کسی بھی ایک پارٹی کے لیے اپنی حمایت کا فیصلہ کریں گے۔

۲- مسلم عمائدین سختی کے ساتھ ایسے مطالبات اور بیانات سے بچیں جو اکثریتی فرقے کے جذبات کو بھڑکا کر انھیں اس سیاسی پارٹی سے دور کردیں جس کی حمایت مسلمان کر رہے ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ دوسرا نکتہ نہایت ہی اہم ہے کہ اگر کسی سیاسی پارٹی سے اکثریتی طبقہ ہی ناراض ہوجائے تو ہمارے قیمتی ووٹ بھی اسے اقتدار تک نہیں پہنچا سکتے۔ پھر یقین کیجیے کہ جسے ہم نے اپنے قیمتی ووٹ دیے ہیں وہ یک لخت ہم سے سارے رشتے ناطے توڑ لے گا کہ یہ دنیا ہے یہاں غیروں کو ہمارا خیال بھی آئے گا تو ''ہمدردانہ'' نہیں بل کہ ''مفاد پرستانہ''۔ اس طرح ہم سب کچھ نچھاور کر کے بھی بے وقعت سمجھے جائیں گے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اعلیٰ تعلیم کے فقدان کی وجہ سے آج بھی مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ''غیر مفید جذباتی نعرے'' لگانے والے کو ہی اپنا حقیقی قائد سمجھنے لگتا ہے، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس طرح کے نعروں سے ملت کو فائدہ پہنچے گا یا نقصان۔ کیا جماعتی نقصان سے کہیں زیادہ یہ بہتر نہیں کہ ہزار سست رفتاری کے ساتھ ہی سہی ملت اسلامیہ کو کوئی فائدہ پہنچ جائے؟

ہندوستان ترقی کی راہ پر چلتے ہوئے اپنی تہذیبی روایات سے دور

معاشی اعتبار سے مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی میدان میں بھی پیش قدمی خوش آئند ہے

گرمی کی چھٹی کے موقع پر ہندوستان کا سفر ہوا۔ اس درمیان کانفرنسوں، نشستوں اور میٹنگوں میں شرکت کے لیے پٹنہ، رانچی، دہلی اور جمشید پور جانا ہوا۔ یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ گذشتہ دس سالوں میں ہندوستان نے معاشی اور تعلیمی اعتبار سے کافی ترقی کی ہے۔ نوجوان نسل میں تعلیم سے دل چسپی بڑھی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ نوے کی دہائی تک صنعت وحرفت سے متعلق کورسیس کے کالج اس قدر قلیل ہوتے تھے کہ ان میں داخلہ ہی سب کے بس کی بات نہ تھی۔ طلبہ اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ داخلے کے مقابلہ جاتی امتحان میں شرکت کرتے ہوئے ہی گزار دیتے تھے اور پھر تھک ہار کر اپنے خواب ادھورا چھوڑ دیتے تھے، لیکن انٹرنیٹ اور ویب سائٹ کے کثرتِ استعمال نے دوریاں سمیٹ دی ہیں اور آن لائن تعلیم کی سہولت نے بہت حد تک حصولِ علم ومعرفت کو سہل بنا دیا ہے۔ اب چھوٹے چھوٹے قصبوں میں قابل اعتماد یونی ورسٹیوں اور مشہور ومعروف کالجوں کے اسٹڈی سینٹر کھلے دکھائی دیتے ہیں، جہاں طلبہ وطالبات اپنے اے دوق کے مطابق علم وفن کے مختلف میدانوں میں مہارت حاصل کر رہے ہیں۔ اس طرح اپنے شہروں میں ہی رہتے ہوئے نہایت کم خرچ پر اعلیٰ تعلیم کا حصول یقینی ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پہلے پس ماندہ دیہات کے بچے خال خال ہی صنعت وحرفت کی اعلیٰ تعلیم کا شوق رکھتے تھے، لیکن اب کثرت کے ساتھ حصولِ علم کا شوق دیہات کے بچوں میں بھی پرورش پا رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ پچھلے سفر میں میرے ساتھ چند نوجوان سفر کر رہے تھے۔ میں نے جب ان

کے متعلق دریافت کیا تو وہ کہنے لگے کہ ہم لوگ پنجاب میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان کے اندازِ گفت گو سے اطرافِ جمشید پور کے رہنے والوں کا سا گماں ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھ ہی لیا کہ آپ سب رہنے والے کہاں کے ہیں؟ جواب میں انھوں نے ایسے علاقے کا نام لیا جو شاید کسی ادیب کے نقشہ دیہات کھینچنے کے ضمن میں ہی آسکتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی مسلمانوں کے لیے خوش آئند ہے کہ ماضی کے مقابلے میں اب کہیں زیادہ مسلمان اپنے بچوں کی تعلیم کے حوالے سے فکرمند دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے اصحابِ ثروت جن میدانوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوایا کرتے تھے، اب کم تنخواہ والے بھی اسی جانب متوجہ ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں ایک مدرسے کے ناظم مطبخ کا نام لے سکتا ہوں۔ خود تو پڑھے لکھے نہیں ہیں اور نہ ہی تنخواہ بہت زیادہ ہے، لیکن اپنے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کا ایسا جذبہ صادقہ تھا کہ اپنے ایک بچے کو انھوں نے **MBA** کی تعلیم دلوا کر ہی دم لیا۔ اسی طرح ایک مسجد کے امام نے بھی بڑی ہمت دکھائی اور اپنے ایک صاحب زادے کو صنعت وحرفت کی تعلیم دلوانے کے لیے بنگلور بھیجا۔ امید ہے کہ جلد ہی وہ اپنے والد کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر دیں گے۔ میں ایک اور مدرسے کے مدرس کے بارے میں جانتا ہوں جنھوں نے اپنے بیٹے کو **ITI** میں داخل کروایا ہے۔ یہ ایک دو مثالیں نہیں جنھیں شاذ و نادر کے خانے میں ڈال کر نظرانداز کر دیا جائے، بل کہ گرد وپیش پر نگاہ ڈالیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ ترقی میں مسلمان بھی بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آنے والے دنوں میں ہندوستان کی دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں کی پس ماندگی کا گراف بھی گرتا ہوا نظر آئے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے صنعت وحرفت کی تعلیم کے حصول میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن یہ بات تشویش ناک ضرور ہے کہ لوگ عصری تعلیم اور معاشی خوش حالی کے پس پردہ اپنی تہذیب بھی چھوڑتے جا رہے ہیں۔

ابھی حال ہی میں حیدرآباد کے ایک تاجر نے اپنے سال گرہ کے موقع پر جس طرح کی

تقریب منعقد کی ہے وہ نہایت ہی شرمناک اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کے خلاف بھی ہے۔ جناب نے دہلی، پنجاب، ممبئی اور دیگر علاقوں سے پیشہ ور لڑکیوں کو دعوت دی جو نیم عریاں لباس میں رقص کر رہی تھیں اور مہمان شرکا شراب کے نشے میں شرم ناک حرکتیں کر رہے تھے، بل کہ پولیس کی رپورٹ کے مطابق بعض مہمان حجروں میں بیٹھے لڑکیوں کے ساتھ شرافت و پاکیزگی کا لباس تار تار کرتے ہوئے بھی دکھائی دیے۔

یہ کوئی ایک دو واقعہ نہیں بل کہ اگر آپ پورے ہفتے کے اخبارات کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس طرح کی محفلیں روزمرہ کا معمول بن گئی ہیں۔ غور کریں کہ اس طرح کی محفلیں نہ صرف اسلامی شریعت کے خلاف ہیں، بل کہ ہندوستانی تہذیبی روایات سے میل نہیں کھاتیں۔ ہندوستان کی تہذیب وتمدن کے سائے میں خواتین اپنے چہروں پر آنچل گراتی ہیں، جب کہ ''جدید فیشن'' کے بہتے ہوئے سیلاب نے خواتین کے آنچل ہی اچک لیے ہیں۔

ہو سکے تو تاریخ کے جھروکھوں سے دس بیس سال پیچھے پلٹ کر دیکھیں، سڑک پر چلتی ہوئی ایک ہندوستانی عورت کا سارا جسم کپڑوں میں ملفوف نظر آئے گا، لیکن آج تو جیسے کم سے کم کپڑے ہی ''ترقی وشرافت'' کی علامت بن گئے ہوں۔

اب ذرا ایک دوسرے کے آداب واحترام کے پس منظر میں حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں، موجودہ حالات میں نمایاں فرق محسوس کریں گے۔ احترام وعقیدت کے جذبے میں ہندوستانی تہذیب کے مطابق بڑوں کا پیر چھونا عام سی بات تھی، لیکن اب اس روایت کے پاسدار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ پہلے بڑوں کے سامنے اونچی آواز میں گفت گو کرنا معیوب تھا، لیکن اب تو بڑوں سے منہ در منہ بات کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ پہلے والدین کی خدمت کرنے کو سعادت مندی سمجھا جاتا تھا اور اب نئی تہذیب وتمدن کی فہمائش پر نئے شادی شدہ جوڑے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ خاندانی یک جہتی اور رواداری کے نشانات مٹ رہے ہیں اور فیس بک کے سہارے نئے نئے لوگوں سے تعلقات بہتر کرنا مستحسن سمجھا جا رہا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ قدیم ہندوستانی تہذیبی روایات کو

جدید معاشی ترقی وخوش حالی کی چوکھٹ پر قربان کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جا رہی ہے۔

صاحبو! ان افسوس ناک حالات کا سب سے تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ تہذیبی روایات کی اس واضح تبدیلی کو بہ جائے معیوب سمجھنے کے مستحسن سمجھا جا رہا ہے۔ لوگ فخر سے اپنے نونہالوں کی بے باکانہ گفت گو کو لوگوں کے سامنے نقل کر رہے ہیں۔ جسم سے چپکے ہوئے نیم عریاں لباس کو ترقی وخوش حالی کی علامت بنا دیا گیا ہے۔ یہ بات دو اور دو چار کی طرح سے مسلم ہے کہ جب تک انسان کسی بات کو معیوب نہ سمجھے اسے کیوں کر ترک کر سکتا ہے؟ یہ انسان کی جبلی طبیعت کا خاصا ہے کہ وہ کسی بات کو اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتا جب تک کہ وہ اسے ناپسند نہ کرے۔ اس لیے یہ کڑوی حقیقت بہ ہر حال تسلیم کرنی پڑے گی کہ موجودہ عام حالات کو دیکھتے ہوئے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ مستقبل قریب میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اس لیے ارباب حل وعقد کو چاہیے کہ وہ حالات کی نزاکت کو محسوس کریں اور ایسے لائحہ عمل بنائیں جن سے لوگوں کے سامنے نئی تہذیب وتمدن کی تباہ کاریوں کو بے نقاب کیا جا سکے تاکہ مستقبل قریب میں کسی ممکنہ تبدیلی کی راہ ہموار ہو سکے۔

ہند پاک تجارتی تعلقات ایک نئے عہد میں داخل

انسان کے اندر ودیعت شدہ "جذبہ مقابلہ" کے فطری رجحانات کی وجہ سے ہندو پاک معاشی طور پر مزید مستحکم ہو جائیں گے

ہندوستان اور پاکستان کو برطانوی استعمار سے آزادی حاصل کیے ہوئے ساٹھ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے، لیکن ابھی بھی ان کے درمیان ویسے تعلقات نہیں جو پڑوسی ممالک میں عموماً ہوا کرتے ہیں۔ براعظم یورپ و امریکہ میں کئی ایسے پڑوسی ممالک ہیں جن کے درمیان نہ صرف آزاد تجارتی اصول وضوابط نافذ العمل ہیں، بل کہ بغیر کسی ویزے کے ان کے شہری آپس میں ایک دوسرے کے یہاں بے روک ٹوک آجا بھی کر سکتے ہیں۔ اور اب تو برطانیہ کے علاوہ سارے یورپی ممالک کی کرنسی بھی ایک ہو گئی ہے۔ اس طرح عہدِ حاضر میں اتحاد و اتفاق کے سارے ممکنہ زاویوں کو پیش نگاہ رکھ کر ایک دوسرے کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

اسے بدقسمتی کہیے کہ برصغیر کی آزادی کے ساتھ ہی دونوں ممالک کے درمیان اختلافات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لفظی جھڑپوں سے بات جنگ وجدال تک پہنچی اور پھر تعلقات کشیدہ ہوتے چلے گئے۔ اب ذرا دیکھیے کہ ۱۹۹۱ء۔۱۹۹۶ء کے درمیان نرسمہا راؤ حکومت میں ہندوستان نے پاکستان کو تجارتی اعتبار سے (MFN) یعنی ''نہایت ہی پسندیدہ ممالک'' کی فہرست میں شامل کر دیا، لیکن جوابی طور پر پاکستان نے ایسا نہیں کیا کہ دونوں ممالک ان سہولیات سے فیض یاب ہو سکتے جو اس اصطلاح کے درجے میں آنے والے ممالک کو حاصل ہوتی ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۶ء میں بے نظیر بھٹو نے اس پس منظر میں غور وفکر کرنے کے لیے ایک پینل بنایا تھا تا کہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ ہندوستان کو نہایت پسندیدہ ممالک کی فہرست میں شامل کر لینے سے پاکستان کی اقتصادیات پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوں گے؟ کہا جاتا ہے کہ اس پینل نے مختلف جہتوں سے غور وفکر کرنے کے بعد بے نظیر بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ اس قسم کے اقدامات پاکستان کے حق میں نہایت منفی ہوں گے، لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ پاکستانی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اس اقدام کو مسئلہ کشمیر کے ساتھ مربوط کر دیں کہ جب تک مسئلہ کشمیر حل نہیں ہو جاتا پاکستان ہندوستان کو پسندیدہ ممالک کی فہرست میں شامل نہیں کر سکتا۔

بے نظیر کے بعد زمام حکومت سنبھالنے والے نواز شریف اور پرویز مشرف کے دور میں بھی پاکستان کا یہی موقف رہا۔ کہنے کو تو اس کے پیچھے کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، لیکن جو بات کسی حد تک معقول لگتی ہے وہ یہ کہ افغانستان کے لیے کراچی ہی کی واحد بندرگاہ ہے جسے وہ اپنے برآمدات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ افغانستان کے لیے یہ سہولت مہیا کرنے کے عوض پاکستان اچھے خاصے فائدے حاصل کرتا ہے۔ پاکستان کو یہ خطرہ تھا کہ ہندوستان کو پسندیدہ ممالک کی فہرست میں شامل کرنے کے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ ہندوستان اور افغانستان کے درمیان گہرے تعلقات کی بنیاد پر پاکستان کے زمینی راستے کے استعمال کے ساتھ سامانِ تجارت کی آمد ورفت شروع ہو جائے اور پھر افغانستان کراچی کی بہ جائے ممبئی کی بندرگاہوں کا استعمال کرنے لگے۔

اس پس منظر میں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ پاکستان میں کپڑے، چمڑے کے سامان اور کھیل کود کی اشیا کی مصنوعات کے ۷۵٪ کا دارومدار برآمد پر ہے کہ جس سے وہ اپنی آمدن کا دو تہائی حصہ بناتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ پاکستان میں کپڑے اچھی نوعیت کے ہی بنتے ہیں جو ہندوستان کے مقابلے میں بڑے قیمتی ہوتے ہیں، لہٰذا ہندوستان کے ساتھ تجارتی روابط مستحکم ہونے کی صورت میں یہ خدشہ تھا کہ کہیں ہندوستان کے سستے نرخوں پر فروخت ہونے والے کپڑے پاکستان میں اپنی ساکھ نہ بنا لیں اور پاکستان کو نقصان پہنچے۔

بہ ہر کیف ماضی میں برسوں تک اپنی پالیسی پر قائم رہنے کے بعد اب پاکستان نے کروٹ بدلی ہے اور ہندوستان کو بھی تجارتی اعتبار سے ”نہایت ہی پسندیدہ ممالک“ کی فہرست میں شامل کرلیا گیا ہے۔ عام طور پر دنیا نے اس اقدام کا خیر مقدم تو کیا ہے، لیکن خود پاکستان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے بھرپور مذمت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی موجودہ حکومت کے ارکان بار بار یہ صفائی دے رہے ہیں کہ ہندوستان کے ساتھ تجارتی روابط کے استحکام سے ملک کو فائدہ حاصل ہوگا۔

مجھے یاد آیا کہ جب ایران سے گیس پائپ لائن پاکستان کے راستے ہندوستان تک طویل کرنے کا منصوبہ زیر بحث تھا، اس وقت پاکستان نے پرزور انداز میں اس کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ پاکستان ایسے کسی بھی منصوبے کی حمایت نہیں کرسکتا۔ اسی دوران جب اس وقت کے صدر پرویز مشرف ایران کے دورے پر گئے تو سربراہی اجلاس میں اس مسئلہ کو اٹھایا گیا اور ایران نے حکومتی سطح پر پرویز مشرف سے درخواست کی کہ وہ پاکستانی موقف پر نظر ثانی کریں۔ پاکستان واپسی پر پرویز مشرف نے اپنے احباب سے مشورہ کیا اور اربابِ حل وعقد کو قائل کرنے میں کام یاب ہوگئے کہ ایران سے گیس پائپ لائن پاکستان تک لانے کے مقابلے میں اسے اگر ہندوستان تک کردیا جائے تو لاگت میں نمایاں کمی آجائے گی اور پاکستان کو مالی اعتبار سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ بلاشبہ یہ اقدام ہندوستان کے حوالے سے پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ایک بڑی تبدیلی کے پس منظر میں دیکھا گیا اور پھر اس مشترکہ منصوبے پر گفت وشنید کے دور کا آغاز ہوگیا۔

حقائق جو بھی ہوں لیکن یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہندوپاک کے درمیان تجارتی روابط کے استحکام سے دونوں ملکوں کے عوام کو فائدہ پہنچے گا۔ چند ماہ قبل پاکستان کی وزیر اطلاعات فردوس عاشق اعوان نے بیان دیا ہے کہ اب دھیرے دھیرے ہندوستان کے ساتھ تجارتی معاملات بہتر ہوجائیں گے اور منفی اشیا کی فہرست میں تیزی کے ساتھ ردوبدل کیا جائے گا۔ اس ضمن میں انھوں نے اعلان کیا کہ دسمبر تک بارہ سو نو اشیاء منفی تجارتی فہرست میں شامل رہیں گی۔

اسی کے ساتھ ساتھ پاکستان میں موجود ہندوستان کے ہائی کمشنر شرد سبروال نے بھی پاکستان کے تجارتی وفود سے ملاقاتیں شروع کردی ہیں۔ انھوں نے ایک نشست میں کہا ہے کہ ہندوپاک کے درمیان تجارت کا حجم ابھی دو ارب ڈالر کے قریب ہے جو بڑھ کر اگلے سال تک چھ ارب ڈالر تک پہنچ جائے گا۔ ان کے بیان کے مطابق ہندوستان کی معیشت کا کل حجم ایک کھرب چار ارب ڈالر کے قریب ہے۔ اس بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ سال ہندوستان کی کل معیشت کا پانچ فی صدی پاکستان کے ساتھ تجارتی تعلقات سے حاصل ہوگا۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک کو دیکھتے ہوئے گوکہ اسے بہت زیادہ نہیں کہا جاسکتا، لیکن تجارتی اصول کے مطابق نئے بازار تک رسائی حاصل کرلینا کسی طور کم اہمیت کا حامل نہیں۔

صاحبو! اس حقیقت سے انکار نہیں کہ آنے والے دنوں میں ہندوپاک کے درمیان تجارتی روابط کے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقعات ہیں، جن کا فائدہ دونوں جانب کی عوام کو ہوگا۔ یہ بات اس لیے بھی وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ حالات میں پاکستان اپنی ضرورت کے حوالے سے ہندوستانی مصنوعات تیسرے ممالک کے توسط سے درآمد کرتا رہا ہے۔ ان ممالک میں تھائی لینڈ اور عرب امارات کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ چوں کہ مشنری کے سامان جو جاپان وغیرہ میں تیار کیے جاتے ہیں وہ کافی مہنگے ہوتے ہیں اس لیے پاکستان کے مفاد میں یہی تھا کہ وہ ہندوستان میں بنے ہوئے سستے مشنری کے سامان درآمد کرے۔ اب جب کہ تجارتی تعلقات بہتر ہورہے ہیں، پاکستان براہِ راست ہندوستان سے اپنی ضرورت کی چیزیں درآمد کرلے گا اور اس طرح تیسرے ملک کے واسطہ کی وجہ سے آنے والا خرچ بچ جائے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر ودیعت شدہ ”جذبہ مقابلہ“ کے فطری رجحانات کی وجہ سے بھی دونوں طرف کے لوگوں میں مزید ترقی کرنے کا حوصلہ بیدار ہوگا اور یہ بہت بڑی کام یابی کہلائے گی۔

کیا حکومت سے حج سبسڈی کا مطالبہ جائز نہیں ہے؟

حج سبسڈی سے قومی خزانے پر بھی بوجھ پڑتا ہے
اور حاجی کی جیب پر بھی مزید بار بڑھ جاتا ہے

برسوں سے فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے ہندوستان سے مسلمان پانی کے جہاز کے ذریعہ بھی جاتے رہے اور ہوائی جہاز کے ذریعہ بھی، لیکن پانی کے جہاز کی خستہ حالت کو دیکھتے ہوئے حکومتِ ہند نے ۱۹۹۵ء میں حج کے لیے بحری سفر پر پابندی عائد کردی۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سفری اخراجات میں اچانک کئی گنا کا اضافہ ہوگیا۔ حکومتِ ہند نے اپنے شہریوں پر ہونے والی گراں باری کو تقسیم کرنے کے مقصد سے حج سبسڈی دینے کا اعلان کیا۔ اس تاریخی حقیقت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حجاج نے حج سبسڈی کے لیے حکومت سے کوئی مطالبہ نہیں کیا، بل کہ حکومت نے بحری سفر کی سہولت کے ختم کیے جانے پر عام حجاج کو راحت دینے کے لیے خود ہی حج سبسڈی دینا شروع کردیا۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ جیسے آپ پانی پینے کے عادی ہوں اور حکومت پانی کی درآمد پر پابندی عائد کرتے ہوئے کول ڈرنکس متعارف کرائے۔ اب ظاہر ہے کہ جب پانی پر پابندی عائد کی جارہی ہے تو یہ حکومت کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لیے کول ڈرنکس کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے سہولت بھی فراہم کرے۔ اس طرح وہ عام شہریوں کے لیے کول ڈرنکس کی قیمت میں شراکت کرتے ہوئے تخفیف کردے تو اس میں تشویش کیسی؟ اسے حکومت کی جانب سے "بھیک" کا نام دینا کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟ سو کی ایک بات کہ اپنے شہریوں کو سہولتیں بہم پہنچانا حکومت کی آئینی ذمہ داری ہوتی اور حج

سبسڈی بھی حکومت کی جانب سے شہریوں کو دی جانے والی سہولتوں کے زمرے کی چیز ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ ۲۰۱۰ء میں وزارتِ اقلیتی امور نے یہ کہتے ہوئے اسے بند کرنے کا مطالبہ کیا تھا کہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ ابھی حال ہی میں سپریم کورٹ نے یہ مرکزی حکومت کو ہدایت دی ہے کہ وہ دھیرے دھیرے حج سبسڈی کے بجٹ میں تخفیف کرتے ہوئے اسے ۲۰۱۷ء میں پورے طور پر ختم کردے۔ اس ہدایت کے ساتھ ہی یہ مسئلہ ایک بار پھر مسلم مخالف عناصر کا موضوعِ سخن بن گیا ہے۔

اسی کے ساتھ بعض مسلم تنظیمیں بھی حج سبسڈی کو ختم کرنے کی گزارش کررہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں کے مطالبے میں یکسانیت کے باوجود وجہ مطالبہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مسلم دشمن عناصر تو یہ کہہ کر اسے ختم کروانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو رعایت دینا کسی طور مناسب نہیں، جب کہ بااثر مسلمان شخصیتیں اسے یہ کہہ کر ختم کرانا چاہتی ہیں کہ حج سبسڈی کی وجہ سے غیروں کو طعن وتشنیع کا موقع ملتا ہے یا یہ کہ شرعی اعتبار سے حج سبسڈی کے سہارے حج کرنا شریعت اسلامی کے منافی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں کے مطالبات مناسب نہیں۔ اکثریتی طبقے کو سمجھنا چاہیے کہ اگر مذہبی سفر پر حکومت کی جانب سے دی جانے والی سہولت مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں تو پھر ان کے لیے بھی مناسب نہیں ہونی چاہیے، جب کہ انھیں شری لنکا کے سیتا ماتا مندر اور کمبوڈیا کے انکور واٹ مندر کے لیے بھی حکومت سہولتیں مہیا کرتی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک ہی طرح کی سہولت انھیں ملے تو بجا ہے اور مسلمانوں کو ملے تو بے جا ہوجائے؟ پھر مسلمانوں کو بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر غیروں کے شکووں کے آگے اسی طرح سپر ڈالتے رہے تو پھر حکومت کی طرف سے دی جانے والی ساری سہولتیں ایک ایک کر کے ختم ہوجائیں گی۔ یہ مزاج قطعی مناسب نہیں کہ ہم دوسروں کے کہنے پر اپنی راہ تبدیل کرلیں۔

ایک دوسرے پہلو سے اس مسئلے کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے ساری دنیا پر نگاہ ڈالیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ہوائی سفر میں ہزار سہولتوں کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ دنیا سے بحری سفر کا رواج یکسر ختم ہوگیا ہو، بل کہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ جس طرح ہوائی سفر میں بہتر سے بہتر کی

طرف پیش قدمی ہوتی رہی ہے، ٹھیک اسی طرح بحری سفر کو بھی دل کش اور جاذب بنانے کے لیے مشہور و معروف کمپنیوں نے پوری توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر میں پر تعیش کروز کی کمی نہیں۔ کیا یہ حکومت کی ذمہ داری نہ تھی کہ بحری سفر پر پابندی عائد کرنے کے بہ جائے اسے بہتر سے بہتر بنانے کی طرف توجہ دیتی۔

مانا کہ عازمین حج کو لے جانے والے پانی کے جہاز کی حالت خستہ ہوگئی تھی، تو کیا حکومت کے لیے اس کا متبادل تلاش کرنا کوئی دشوار تھا؟ آپ مانیں یا نہ مانیں یہ سرتاسر حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ سابقہ جہاز کے ناقابل استعمال ہونے سے پہلے ہی دوسرے جہاز خریدنے کی طرف توجہ دیتی اور کم سے کم خرچ میں مشتاقانِ حج و زیارت کے لیے سفر کو یقینی بناتی۔

ویسے تو حج سبسڈی حکومت کی طرف سے بہ ظاہر ایک بھاری بھرکم تعاون محسوس ہوتا ہے، لیکن جب افادہ واستفادہ کے پس منظر سے دیکھیں تو اس کی قلعی کھل جاتی ہے اور پھر یہ بھی کسی بچے کو لبھانے والے لالی پاپ سے کم نہیں محسوس ہوتا، یا پھر بازاروں میں مفت مفت کی صدائے دل کش کی بازی گری کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

آپ اعتراف کریں گے کہ وہ جو سامانِ تجارت فروخت کرنے کے لیے مفت مفت کی رٹ لگاتے ہیں، حقیقت میں کوئی چیز مفت میں نہیں دیتے، بل کہ کہتے ہیں کہ یہ چیز اتنے میں خرید لو تو یہ دوسری چیز مفت ہے۔ تھوڑی سی ذہنی ورزش سے یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ دکان دار نے دراصل پہلی چیز کی قیمت میں ہی دوسری چیز کی قیمت وصول لی ہے اور مفت مفت کی صدائے پُرکشش سراب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بس یہی حال حکومت کی جانب سے دی جانے والی حج سبسڈی کا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ سالِ رواں کی حج سبسڈی پر غور کر کے دیکھ لیں۔

اس سال حکومت نے ۶۸۰ کروڑ روپے حجاج کو سبسڈی دینے کے لیے خرچ کیے ہیں جو کہ فی حاجی پر تقسیم کیے جائیں تو یہ تقریباً ۲۸۰۰۰ فی کس بنتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میک مائی ٹرپ کے ذریعہ اگر کوئی شخص ۱۵/اکتوبر ۲۰۱۲ء کو دلی سے جدہ جانا چاہے اور

۱۵/نومبر ۲۰۱۲ء کو واپس جدہ سے دلی کے لیے ٹکٹ خریدے تو سعودی عرب ائر لائنز کا ٹکٹ اسے ۲۹۳۱۴ روپے میں پڑے گا، جب کہ انہی تاریخوں میں اگر وہ ائر انڈیا کا ٹکٹ خریدے تو اسے ۶۲۴۷۷ روپے ادا کرنے ہوں گے۔ اس طرح ائر انڈیا سے ٹکٹ خریدنے کی صورت میں اسے ۳۳۱۶۳ روپے زیادہ دینے ہوں گے جو کہ حکومت کی طرف سے ادا کی گئی حج سبسڈی سے بھی زیادہ ہے۔ اس مثال سے نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ حکومت کی جبری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایر انڈیا سے ٹکٹ خریدنے پر حج سبسڈی دیے جانے کے باوجود ہر حاجی کو اپنی جیب سے تقریباً ۵۱۶۳ روپے زیادہ ادا کرنے پڑیں گے۔ یعنی حج سبسڈی کے ذریعہ حکومت ہند کے احسان کا طوق بھی گردن پر اور اپنی جیب سے ایک خطیر رقم کا بے جا خرچ بھی۔

صاحبو! مندرجہ بالا انکشاف کے بعد اس بحث کی سرے سے ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے حکومت سے حج سبسڈی لینا جائز ہے یا نہیں، بل کہ مسئلہ کی نوعیت یہ ہو جاتی ہے کہ حج سبسڈی کس کے مفاد میں ہے؟ جواب بالکل صاف ہے کہ حج سبسڈی سے حاجی کا کوئی بھلا تو درکنار اس بے چارے کو تو الٹا نقصان ہی ہوتا ہے اور دوسری طرف حکومت ہند کے قومی خزانے سے ہر سال ایک خطیر رقم بھی نکل جاتی ہے، یعنی حج سبسڈی سے حجاج کا بھی نقصان اور حکومت کا بھی۔ ہوسکے تو دن کے اجالے میں ساری دنیا کھنگال ڈالیے اور نکال لائیے کوئی ایسا دانش مند جو ایسے سودے کا حامی ہو کہ جس میں لینے والے کا بھی نقصان ہو اور دینے والے کا بھی۔ مجھے حیرت ہے کہ حج سبسڈی لینے اور نہ لینے کے حوالے سے مسلمان دو گروہوں میں بٹ کر باہم دست و گریباں ہیں، جب کہ ''موضوعِ بحث'' یہ ہونا چاہیے کہ حج سبسڈی کو کار آمد کیسے بنایا جائے؟

اپنوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے والے آنکھیں کھولیں!

اپنے لوگ وقتِ ضرورت قیمتیں بڑھا دیتے ہیں،
جب کہ غیر ضرورت کے وقت اپنی قیمتیں کم کر دیتے ہیں

رمضان المبارک کا موسم رحمت ایک بار پھر ہمارے سروں پہ سایہ فگن ہے۔ ویسے تو اللہ رب العزت کے فضل وکرم کی بارش پورے سال ہوتی رہتی ہے، لیکن اجر وثواب کے پس منظر سے رمضان کے مہینے میں اس کی عنایات میں بے پایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سال کے دیگر مہینوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اس موقع پر مسلمان عبادت و ریاضت میں منہمک دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری طرف افطار وسحری میں انواع واقسام کے کھانے کی وجہ سے دسترخوان کی رونق بھی دوبالا ہو جایا کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کھانے پینے کی عام اشیا کی قیمتیں طلوعِ رمضان کے ساتھ ہی آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ یہ اضافہ اگر غیروں کی طرف سے ہوتا تو شاید ہمیں نہ بہت زیادہ شکوہ ہوتا اور نہ ہی افسوس کہ جب وہ غیر ہی ٹھہرے تو ان سے خیر خواہی کی توقع ہی کیوں رکھی جائے؟ لیکن افسوس تو یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اپنے ہی لوگ رمضان المبارک کے موقع پر قیمتیں بڑھا دیتے ہیں۔ ہندوستان کے بازار کے حوالے سے شاید میری باتوں میں دم نہ ہو کہ یہاں عام طور پر ہول سیل کی گدی پر غیر ہی براجمان ہوتے ہیں، لیکن ذرا اپنے پڑوسی ملک پاکستان پر نگاہ ڈال لیجیے۔ ذرائع ابلاغ کی وساطت سے یہ بات کانوں میں پڑ چکی ہوگی کہ رمضان کے آتے ہی اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ تقریباً ہر ٹی وی چینل والے لوگوں کے تاثرات لیتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ لوگ برملا اپنے غم وغصے کا

اظہار کر رہے ہیں کہ دکان داروں نے رمضان المبارک کے موقع پر حیران کن اضافہ کر دیا ہے۔ پاکستان میں تو ۹۷% مسلمان ہیں اور یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہول سیل کی کرسی پر بھی اسی تناسب سے مسلمان براجمان ہوں گے۔ لہٰذا اب تو یقین کر لیجیے کہ غیروں کے ساتھ ساتھ مسلم دکان دار بھی مسلمانوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر رمضان المبارک کے موقع پر قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ ایک اس اضافے کی توجیہ کرتے ہوئے کہہ پڑے کہ اس موقع پر قیمتیں بڑھا کر ہم اپنی اقتصادی حالت کو کسی حد تک بہتر کر لیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فکر ہی سرے سے غلط ہے۔ ایک مسلمان بھائی کو دبا کر خود مال دار ہونے کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ خیال رہے کہ قیمتوں میں اضافے سے اقتصادی حالت میں بہتری نہیں آتی، بل کہ دورِ جدید میں زیادہ سے زیادہ کھپت پر مبنی پالیسی اختیار کر کے ترقی کرنے والے تاجروں کی مثالیں کثرت سے مل جائیں گی۔ موقع کی مناسبت سے اجازت ہو تو عرض کروں۔

ہندو پاک میں قیمتیں لوگوں کی حاجات کے پیش نظر بڑھتی ہیں، جب کہ یورپ و امریکہ میں لوگوں کی ضرورتوں کے وقت قیمتیں کافی حد تک گر جاتی ہیں۔ عیسائیوں کا سب سے بڑا تہوار کرسمس ہوتا ہے۔ اس موقع پر ہر طرح کی چیزوں کے دکان دار نرخوں میں کمی کرتے ہیں۔ لباس، اشیائے خورونوش، آرائش وزیبائش سے متعلق چیزیں اور تحفے تحائف کی عام قیمتوں سے ایک سرسری موازنہ کریں تو خوش گوار حیرت سے سامنا ہوگا۔ اسی طرح جب اسکولوں میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے تو لکھنے پڑھنے کے حوالے سے کاپی، قلم، روشنائی، ربر، پنسل، فائل اور دیگر اشیا کی قیمتوں میں تو اس قدر کمی واقع ہوتی ہے کہ عقل حیران ہو جاتی ہے کہ اتنے کم داموں میں یہ لوگ کیسے فروخت کر رہے ہیں؟ ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ سالِ گذشتہ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ایک فل سائز کا رجسٹر ہندوستانی کرنسی میں صرف پانچ روپے کا فروخت ہو رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس موقع پر پورے سال کے لیے لکھنے پڑھنے کی اشیا خرید لیتے ہیں۔

کیا اس میں شک کی گنجائش ہے کہ دور حاضر میں مغربی دنیا تجارتی میدان میں کافی آگے نکل چکی ہے۔ سامانِ تجارت کے فروخت کرنے کے لیے لبھانے والے نت نئے طریقے انہیں کی ایجاد ہیں۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے سربراہان ہمیشہ کوششیں کرتے رہتے ہیں کہ کس طرح وہ زیادہ سے زیادہ منافع کما سکیں اور اپنی کمپنیوں کی اقتصادی حالت بہتر بنا سکیں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ مغربی دنیا کے تاجر لوگوں کی ضرورتوں کے مواقع پر قیمتیں بڑھا کر بسیار منافع کمانے کی بہ جائے اسے کم کردیتے ہیں؟

میں نے کئی بار اس عقدہ سے نقاب ہٹانے کی کوشش کی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اشیا کی قیمتیں کم ہوتی ہیں تو نفسیاتی طور پر لوگ انھیں زیادہ سے زیادہ خریدنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب جو غریب ہوتا ہے وہ اپنی ضرورت کے مطابق ہی خریدتا ہے، جب کہ اصحاب ثروت اپنی ضرورتوں سے کہیں زیادہ مقدار میں انھیں خرید لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ایسی چیز جس کی قیمت کم ہو اور وہ زیادہ مقدار میں فروخت ہو تو منافع کے اعتبار سے وہ اس کے مساوی ہوجاتی ہے جو کہ قیمت میں زیادہ ہو اور فروخت کم، بل کہ کہنے دیا جائے کہ بسا اوقات کثرتِ فروخت کی بنیاد پر قلیل منافع دینے والی چیز آمدنی کے لحاظ سے سبقت بھی لے جاسکتی ہے۔

میرے خیال میں یہی وہ فکر ہے جو لوگوں کی ضرورت کے وقت قیمتوں کے کم کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح کی تجارت کا سب سے عمدہ پہلو یہ ہے ایک طرف جہاں متمول افراد زیادہ خرید لیتے ہیں تو دوسری طرف غربا بھی کچھ نہ کچھ خریدنے کی سکت اپنے اندر جٹا ہی لیتے ہیں۔ پھر اس پالیسی کا ایک دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ جب لوگ زیادہ سے زیادہ خریدنے کی کوشش کریں گے تو اس کی کھپت بھی بڑھ جائے گی اور اس طرح کارخانوں میں مزدوروں کو کام کے مواقع بھی زیادہ میسر آسکیں گے۔

یہاں تک تو میں نے محض دنیاوی نکتہ نگاہ سے اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کے بارے میں گفت گو کی ہے اور اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کم نرخوں پر فروخت کرنے سے فوائد کے امکانات بھی روشن ہیں۔ اس توجیہ میں ان لوگوں کے لیے بہت حد

تک پرکشش اور قابل تقلید درس موجود ہے جو تجارت کو محض دنیاوی پس منظر میں دیکھتے ہیں، لیکن وہ لوگ جو ہم مذہب ہیں انھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان کے دلوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے حوالے سے کس قسم کی خیر خواہی کے جذبات ہونے چاہییں اور انھیں کس حد تک دست تعاون دراز کرنا چاہیے؟

بات تلخ لگے گی لیکن یہ بہر حال حقیقت ہے کہ ہم غیروں کے ہاتھوں ہونے والی زیادتیوں پر شکوہ کرتے نہیں تھکتے۔ جب کبھی غیروں نے مسلمانوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے، ہم نے صدائے احتجاج بلند کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارا یہ ردِ عمل غلط ہے، بل کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے، لیکن عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ غیروں کے دامن پر خونِ ناحق کے نشانات دیکھنے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اپنے دامن میں پڑے ہوئے دھبے پر بھی نگاہ ڈالنی چاہیے کہ زیادتی بہ ہر حال زیادتی ہے۔ کسی مظلوم کے خلاف زیادتی ہورہی ہو تو اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ زیادتی کرنے والا کون ہے؟ وہ اپنا ہے یا پرایا ہے، وہ تو صرف اپنے زخموں کی ٹیس سے نڈھال ہوتا ہے۔

صاحبو! یہ بات ذہن سے نکال دیں کہ کسی کا خون کرنا ہی صرف زیادتی ہے، بل کہ ہر وہ اقدام جو کسی مسلمان کے لیے اذیت کا باعث ہو وہ سب کچھ میرے نزدیک زیادتی کی فہرست میں شامل ہے۔ ہو سکے تو کسی غریب سے پوچھیے کہ رمضان المبارک کے موسم رحمت میں اشیائے ضروریہ میں بے جا گرانی سے اسے کس قدر اذیت پہنچتی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے جواب دینے سے قبل ہی چہرے پر درد و کرب کی لکیریں وہ سب کچھ بتا دیں گی جو وہ احساسِ شرمندگی سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا نظر آئے گا۔ میرے نزدیک یہ انصاف و دیانت کے خلاف ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف ہونے والی زیادتیوں پر غیروں سے تو پوری طاقت کے ساتھ شکوہ کریں، لیکن خود اپنوں کے طرزِ عمل پر "احساسِ شکوہ" تک نہ ہو۔

مسلمانوں کا ہر عمل ''اِسلام'' کی ترجمانی نہیں کرتا

اپنے نہاں خانۂ دل میں یہ بات اچھی طرح بٹھالیں
کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ سب سے بہتر ہے

اس بات سے کسے انکار ہے کہ اچھے اور برے لوگ ہر مذہب کے ماننے والوں کے درمیان ہیں، لیکن یہ بات تکلیف دہ ضرور ہے کہ کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے اگر جرائم کا ارتکاب کریں تو انھیں ان کے مذاہب کی ترجمانی کے پس منظر میں نہ دیکھا جائے اور جب وہی جرم کوئی مسلمان کرے تو اسے اسلامی تعلیمات کی ترجمانی کے خانے میں ڈال دیا جائے۔ یعنی جرم کا تجزیہ کرتے ہوئے دو الگ الگ توجیہات اختیار کی جائیں: ایک اپنوں کے لیے اور ایک غیروں کے لیے، جب کہ عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی مسئلے پر گفت گو کرتے ہوئے صرف مسئلے پر نگاہ رکھی جائے نہ کہ مسئلے سے منسلک افراد پر۔ فکر ونظر کا یہی وہ تضاد ہے جس نے عالمی سطح پر ایک بڑے مذہب کے ماننے والوں کو بے چینی و اضطراب سے دوچار کر رکھا ہے۔ ابھی حال ہی میں ضلع باغپت کے اساڑا گاؤں کی پنچایت نے عورتوں کے حوالے سے چند ضابطے بنائے ہیں۔ جوں ہی یہ خبر ذرائع ابلاغ کے ہاتھوں لگی، انھوں نے اسے چٹ پٹی بنا کر اس طرح سے دنیا کے سامنے پیش کیا کہ یہ ''اسلام'' ہی کا وہ چہرہ ہے جو اب تک پردۂ خفا میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی سرکردہ مسلم سیاسی قیادت کو صفائی دینی پڑی کہ اس طرح کے اقدامات کا کوئی تعلق ہمارے مذہب سے نہیں ہے۔ اتنی موٹی بات تو دنیا کا ہر انسان سمجھتا ہے کہ کسی طبی مسئلے پر اطبا سے رائے لی جائے، کسی سیاسی مسئلے پر سیاست داں سے گفت گو کی جائے، تعمیر ومرمت کے سربستہ راز کسی ماہر انجینئر

کی وساطت سے ہی حل کیے جائیں اور کسی تجارتی موضوع کی عقدہ کشائی کے لیے ماہر تجارت سے رابطہ کیا جائے، پھر آخر کسی مذہب کے حوالے سے مذہبی راہ نما کی رائے ہی کو معتبر کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ آخر ایک عام مسلمان کی ذاتی رائے کو ''اسلام'' کا نکتۂ نگاہ کیوں سمجھ لیا جاتا ہے۔

لگے ہاتھوں یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہر وہ مسلمان جو سر پر ٹوپی اور چہرے پر داڑھی سجائے ہوئے ہو وہ ''عالم دین'' نہیں ہے۔ ایسے لوگ بلاشبہ قابل قدر مسلمان تو ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان کے اقدامات بھی ہمیشہ اسلامی تعلیمات ہی کی عکاسی کریں۔ اس کے برعکس ایسے بہتیرے لمحات تاریخ کے صفحات میں قید ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظاہری وضع قطع سے بڑے ہی بھاری بھرکم دکھنے والے لوگ ایسے ایسے اقدامات کر بیٹھتے ہیں کہ حسرت وافسوس سے آنکھیں خون آلود ہو جاتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ چند سال پہلے میں صوبہ جھارکھنڈ کے ضلع ہزاری باغ کے دورے پر تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق احباب نے پریس کانفرنس کا اہتمام کر رکھا تھا۔ چوں کہ دہلی، جھارکھنڈ اور بہار کے بعض دینی مدارس اور تحریکوں کی ذمہ داری میرے سر پر ڈال دی گئی ہے، اس لیے ایک غیر مسلم رپورٹر نے بڑا ہی چبھتا ہوا سوال کر لیا۔ وہ کہنے لگے کہ آپ لوگ مدارس اسلامیہ میں طلبہ کو کس طرح کی تعلیم دیتے ہیں کہ وہ فراغت کے بعد ہاتھ میں رسید تھامے جگہ جگہ چندہ وصول کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں؟ آخر انھیں جدید علم وہنر سے آشنا کرنے کے لیے کوئی اقدامات کیوں نہیں کرتے؟ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس میں غلطی ہماری نہیں ہے، بل کہ آپ کی ہے۔ وہ کہنے لگے وہ کیسے؟ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ سارے ٹوپی داڑھی والے کو مدارس اسلامیہ سے فارغ التحصیل علما کی صف میں شامل کیوں کر لیتے ہیں؟ اس جواب پر بھی خوب محظوظ ہوئے۔

موضوع کی مناسبت سے وہ جواب بھی سنتے چلیے جو دنیائے باکسنگ کے شہنشاہ محمد علی کلے نے میڈیا کو دیا تھا۔ امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حادثے کے بعد محمد علی کلے نے گراؤنڈ زیرو کا دورہ کیا تھا۔ آپ کی شہرۂ آفاق شخصیت کی وجہ سے ذرائع ابلاغ کے نمائندے بڑی

تعداد میں ارد گرد جمع ہو گئے۔ اسی درمیان کسی متعصب نمائندے نے چھیڑتے ہوئے کہا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی و بربادی کے پس پشت جن افراد کے نام لیے جا رہے ہیں وہ سب کے سب آپ ہی کے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ محمد علی نے بڑی ہی متانت کے ساتھ جو منہ توڑ جواب دیا وہ تاریخ کے صفحات میں آج تک محفوظ ہے۔ انھوں نے کہا کہ جنگِ عظیم کے نتیجے میں ہونے والی عالمی تباہی کے لیے ہٹلر کا نام لیا جاتا ہے جو کہ آپ کے مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ لہٰذا آپ اس حوالے سے کیا کہیں گے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح کے سوال کے پس پشت جو مقصد پوشیدہ رہا ہوگا وہ یہی کہ محمد علی کو شرمندہ کر دیا جائے، لیکن بد قسمتی سے وہ خود ہی سکتے میں آ گیا۔

ذرا سوچیے تو سہی کہ دنیا میں ہونے والے کسی جرم کی پاداش میں لوگ مجرم کے اہلِ خانہ کو قابلِ مواخذہ نہیں سمجھتے، لیکن عجیب دورنگی ہے کہ کسی مسلمان کے جرم کا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا جاتا ہے کہ دنیا کا ایک مسلمان بھی باہر نہ رہ سکے۔ خیال رہے کہ ہم کسی مسلمان کے جرم کا دفاع نہ کبھی کرتے ہیں اور کریں گے، لیکن اتنا تو ہمیں کہنے کا بہر حال حق ہے کہ کسی کے کیے ہوئے جرم کو ہمارے سر نہ ڈال دیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی پیش نگاہ رہے کہ دنیا میں ہزاروں رسم و رواج کے ساتھ لوگ رہتے ہیں۔ ایک علاقے میں رائج شدہ رسم و رواج کو دوسرے علاقوں کی تہذیب و تمدن کی نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کرنا قطعی مناسب نہیں۔ جس طرح ہر انسان کی ضرورت ایک جیسی نہیں ہوتی، ٹھیک اسی طرح دنیا کے ہر علاقے کے تقاضے یکساں نہیں ہوتے۔ علاقے کے لوگ اپنی ضرورتوں کے پیش نظر ضابطے بنا لیتے ہیں جو کبھی تو حق و صداقت کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور کبھی ظلم و زیادتی کی تصویر۔ بہ ہر کیف میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں لوگوں کے ذریعہ بنائے گئے رسم و رواج کو مقامی حالات کے نتائج پر محمول کرنا چاہیے اور بس۔ اب یہی دیکھیے کہ کل ہی ایک قریب کے گاؤں میں لڑکیوں نے خود ہی اپنی علاحدہ پنچایت منعقد کی اور یہ طے کیا ہے کہ وہ نہ جینز پینٹ پہنیں گی، نہ لمبے ناخن رکھیں گی اور نہ ہی بال تراشیں گی۔ اس موقع پر انھوں نے از خود اس بات کو دہرایا کہ وہ اپنے مفاد کو بہتر سمجھتی ہیں اور اسی کے مطابق وہ اقدامات کریں

گی۔ کیا اسے بھی یار دوست ''صنف نازک پر زیادتی'' کے پس منظر میں دیکھیں گے؟ خدارا خواتین پر خود اپنے ہی خلاف ظلم و زیادتی کے الزامات تو نہ لگائیں! غیروں سے مستعار لیے ہوئے عینک سے اپنی تہذیب و تمدن کو نہ دیکھیں، بل کہ اپنی مذہبی روایات پر فخر کرنے کی عادت ڈالیں۔ یہ بات ذہن و دماغ سے نکال دیں کہ جوان کے پاس ہے وہ ہم سے بہتر ہے، بل کہ اپنے نہاں خانۂ دل میں یہ بات اچھی طرح بٹھا لیں کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ سب سے بہتر ہے۔

صاحبو! اس قبیح فکر و نظر کے حوالے سے اگر یہی کوئی اکا دکا واقعہ ہوتا تو کسی کی فہمائش کے بغیر ہی ہم اسے فراموش کر دیتے، لیکن کیا کہیں کہ اب تو جیسے یہ روز کا معمول بن گیا ہے۔ کہتے ہیں ناں کہ ایک جھوٹ کو پوری قوت کے ساتھ مختلف انداز میں کہتے رہیں تو لوگ بلا وجہ میں اسے سچ سمجھنے لگتے ہیں۔ شاید یہی کوتاہ نظری لوگوں کو حقائق و معارف سے صرفِ نظر کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ کان کھول کر سن لیں کہ کذب و افترا کی موہوم سی چادر ڈال کر مومی شمع کے اجالے کو عارضی طور پر مسدود تو کیا جا سکتا ہے، لیکن دھیرے دھیرے ہی سہی بلا شبہہ ایک نہ ایک دن اجالے کی تپش سے ظلم و استبداد کے ہاتھوں تنا ہوا پردہ جل کر خاک ہوگا اور پھر حقیقت کی ضیا بار کرنوں سے سارا عالم بقعۂ نور بن جائے گا۔

پڑوسیوں کے ساتھ اچھے تعلقات بھی بہتر ہتھیار ہیں

دفاعی مقاصد کے لیے صرف اسلحے پر نگاہ نہ رکھی جائے
بل کہ دوسرے ذرائع بھی تلاش کیے جائیں تا کہ ملکی دولت فلاحی کاموں میں لگائی جاسکے

اس میں دو رائے نہیں کہ ملک کی سرحدوں کا تحفظ نہایت ہی ضروری ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ ملک کی ایک ایک انچ زمین کی حفاظت کی ذمہ داری بہ ہر حال اربابِ حکومت کے سر ہے۔ قوم جب اپنے قیمتی ووٹوں سے کام یاب کر کے اقتدار ان کے حوالے کرتی ہے تو ان سے بجا طور پر یہ توقع بھی رکھتی ہے کہ وہ نہ صرف لوگوں کے بنیادی مسائل حل کریں گے، بل کہ ملک کی سرحدوں کی نگرانی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے تا کہ نہ ہی وطنِ عزیز کی زمین کا کوئی حصہ غیروں کے تصرف میں جانے پائے اور نہ ہی سازشوں کے ذریعہ کوئی بیرونی طاقت ملک کے اندرونی استحکام، امن و آمان اور بھائی چارے کو متاثر کر سکے۔ قوم کی انہی توقعات کے پیشِ نظر برسرِ اقتدار حکومتیں ہر دور میں ملک کے دفاعی نظام کو زیادہ سے زیادہ طاقت ور بنانے کی کوششیں کرتی رہتی ہیں۔ دشمن کو زیر کرنے کے مقصد سے زیادہ سے زیادہ تباہی پھیلانے والے ہتھیار بنانے کی تگ و دو کی جاتی ہے، نیز دوست ممالک کے تجربات کے نتیجے میں نت نئے اسلحے منظر عام پر آنے کے بعد انھیں حاصل کرنے میں دل چسپی دکھائی جاتی ہے۔ عمومی طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ اگر کسی ملک کے ساتھ تعلقات میں تلخی پیدا ہو جائے اور حملے کا شک ہو تو پھر حصولِ اسلحے کی یہ دوڑ مزید بڑھ جاتی ہے۔

اس پس منظر میں ملک کے دفاعی بجٹ کا ایک سرسری جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ گذشتہ ایک دہائی میں دفاعی بجٹ میں دو سے تین گنے کا اضافہ ہو گیا ہے۔ خود سالِ رواں

میں جس دفاعی بجٹ کا خاکہ جناب پرنب مکھرجی نے پارلیامنٹ میں پیش کیا ہے، اس میں سالِ گذشتہ کے مقابلے میں ۱۷.۶۳٪ کا اِضافہ ہوا ہے اور اب یہ بڑھ کر ۴۰.۴۴ بلین ڈالر کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کہ اب انڈیا دنیا میں اسلحے کا سب سے بڑا خریدار بن چکا ہے۔ **Stockholm International Peace and Research Institute (SIPRI)** کی شائع کردہ حالیہ رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۱۔۲۰۰۷ کے درمیان اسلحے کی منتقلی کے حوالے سے دنیا کے پانچ بڑے ممالک کا تعلق براعظم ایشیا سے ہے۔ وہ یوں کہ دنیا کے کل اسلحے کا ۱۰٪ ہندوستان، ۶٪ جنوبی کوریا، ۵٪ پاکستان، ۵٪ چین اور ۴٪ سنگاپور نے منتقل کیا ہے۔ اور دل چسپی کی بات یہ ہے کہ اسی وقفے میں دنیا کے جن پانچ بڑے ممالک نے اسلحہ بیچا ہے، ان میں امریکہ، روس، جرمنی، فرانس اور برطانیہ سر فہرست ہیں۔ ان میں جرمنی کو چھوڑ کر باقی چاروں ممالک وہ ہیں کہ جنھیں اقوام متحدہ کی مجلس امن میں ویٹو پاور حاصل ہے۔ یہی رپورٹ بتاتی ہے کہ دنیا میں اسلحے کی تجارت کا ۷۵٪ حصہ امریکہ فروخت کرتا ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ مارکیٹ میں فروخت ہونے والی عام چیزوں کی قیمتیں ایک ممکنہ حد تک ہی رکھی جاسکتی ہیں، لیکن نت نئے اسلحے کی قیمتوں کا کوئی تخمینہ لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ فرض کریں کسی ملک نے کوئی دفاعی میزائل ایجاد کرلیا ہے اور اس نوعیت کے میزائل دنیا کے کسی دوسرے ملک سے حاصل نہیں کیے جاسکتے، تو اب وہ ملک اس کی قیمت منہ مانگی لے سکتا ہے۔ آپ اگر ضرورت مند ہیں تو بہ ہر حال اسے کسی بھی قیمت پر حاصل کرنا چاہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلحے کی خرید و فروخت میں کثرت کے ساتھ رشوت کا لین دین ہوتا ہے۔

ابھی حال ہی میں فوج کے سربراہ جنرل وی کے سنگھ نے جو سنسنی خیز انکشاف کیا ہے، اس کی گونج تو اب پارلیامنٹ کے ایوان تک جا پہنچی ہے۔ ان کے مطابق ۲۰۱۰ء میں ایک ری ٹائرڈ فوجی افسر نے انھیں اسلحے کے ایک سودے کی منظوری کے بدلے چودہ کروڑ روپے رشوت دینے کی پیش کش کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اسے قبول نہیں کیا اور اس کی شکایت موجودہ وزیر دفاع جناب اے. کے. انتھونی سے کردی۔ اسی کے ساتھ جنرل وی کے

سنگھ نے وزیر موصوف پر یہ الزام بھی لگایا کہ انھوں نے میری اس شکایت پر کوئی اقدام ہی نہیں کیا۔ اس الزام کے طشت از بام ہونے کے بعد وزیر موصوف نے بڑا ہی مضحکہ خیز بیان پارلیامنٹ میں دیا ہے کہ جنرل۔ وی۔ کے۔ سنگھ نے مجھے کسی طرح کی کارروائی کرنے سے منع کر دیا تھا، لہٰذا میں نے اسے وہیں ختم کر دیا۔

کیا کہنے ہیں کہ اب وزارت کی کرسی پر فائز ہونے والے ذمہ دار بھی بڑے سے بڑے نازک معاملات صرف اس لیے درگزر کر دیں گے کہ کوئی ان سے ''صرف نظر'' کرنے کی درخواست کر رہا ہے۔ بہ ہر کیف میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسلحے کی خرید و فروخت میں کثرت کے ساتھ رشوت کے لینے دینے کے انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ جنرل وی۔ کے۔ سنگھ کے اسی بیان کا دوسرا رخ پڑھیے کہ جنھوں نے ان سے اسلحے کے سودے کی منظوری کے عوض چودہ کروڑ روپے کی پیش کش کی تھی، وہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی پیش کش کوئی نئی بات نہیں، بل کہ یہ ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے اور ذمہ دار اسے قبول بھی کرتے رہے ہیں۔

آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ ایک چھوٹے سے سودے کی منظوری کے لیے چودہ کروڑ روپے کی رشوت! اسی کے ساتھ یہ امر بھی ذہن نشیں رہے کہ کیا خبر اسی ایک سودے کے حوالے سے صرف جنرل انٹونی ہی کو نہیں بل کہ درمیان میں پڑنے والے دیگر محکموں کو بھی پیش کش کی گئی ہوگی۔ یہ بات کہنے کی نہیں کہ بیچنے والا اگر اتنی خطیر رقم بہ طور رشوت دے رہا ہے تو وہ اس چھوٹے سے سودے پر منافع کا فی صد کس قدر زیادہ رکھ رہا ہوگا کہ تجارت میں کوئی بھی اپنا نقصان گوارا نہیں کرتا۔ اسی طرح قارئین کے ذہن میں ہوگا کہ بوفورس سودے کے حوالے سے آں جہانی راجیو گاندھی پر رشوت لینے کے الزامات عائد کیے گئے تھے اور غالباً اسی مسئلے کی وجہ سے انھیں الیکشن میں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اس حقیقت سے یہ بات اچھی طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ اسلحے کی خریداری کے پس پردہ ملکی دولت کا کس قدر بے جا اسراف ہوتا ہے۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مستقبل قریب میں اسلحے کے اعتبار سے ہندوستان کے خود کفیل ہونے کی بہت زیادہ توقع ہو۔ اس حوالے سے **Pieter Wezeman** جو کہ **SIPRI** میں شعبۂ منتقلی اسلحہ کے سینئر محقق ہیں' کا بیان پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ

کہتے ہیں کہ کئی دہائیوں سے ہندوستان اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے اسلحے کا ۷۰٪ خود تیار کرے اور غیروں سے اسلحے خریدنے پر انحصار کم سے کم کرے، لیکن ۳۰٪ کا وہ نشانہ جو کئی دہائیوں قبل تک ہندوستان حاصل کر چکا تھا، اب تک وہ اس سے تجاوز کر کے ۷۰٪ کے قریب تک بھی نہیں پہنچ سکا ہے، جب کہ اسلحے کی پیداوار کے لیے کئی بڑے بڑے منصوبے بھاری لاگت کے ساتھ شروع بھی کیے جا چکے ہیں اور اس میدان میں مسلسل تحقیقاتی تجربے بھی ہو رہے ہیں۔

بہ ہر کیف کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ کئی سالوں تک فی الحال ایسی کوئی امید نہیں کہ وطنِ عزیز اسلحے کے میدان میں پورے طور پر خود کفیل ہو سکے گا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ ملکی دولت کا ایک بڑا حصہ ہر حال میں اسلحے کی خرید پر خرچ کیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی پیش نگاہ رہے کہ اتنے اخراجات اور دنیا میں سب سے بڑے اسلحے کے خریدار ہونے کے باوجود جنرل سنگھ کے الفاظ میں ٹینک کے پورے دستے کے پاس دشمن کو شکست دینے کے لیے انتہائی کلیدی اشیا نہیں ہیں اور فضائیہ ۷۰٪ ناکارہ ہو چکی ہے، نیز پاپیادہ فوج بھی ضروری ساز و سامان کے فقدان کے سبب کم زور ہوتی محسوس ہو رہی ہے۔

صاحبو! ان مختصر حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ملک کے تعلقات اگر پڑوسیوں کے ساتھ دوستانہ نہ ہوں تو اس کا بہ راہ راست اثر کس طرح ملک کی معیشت پر پڑتا ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ معاشی اعتبار سے گو کہ ہندوستان بہت تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے، لیکن فی کس آمدنی کے لحاظ سے وہ اب بھی دنیا کے بہت سارے ملکوں سے پیچھے ہے۔ یعنی اقتصادی اعتبار سے بہت سے ملکوں سے پیچھے، مگر اسلحے کے خریداری کے میدان میں سب سے آگے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ملک کی دفاعی ضروریات کے پیش نگاہ ہمیں مضبوط نہیں ہونا چاہیے، بل کہ مدعا صرف اس قدر ہے کہ دفاعی مقاصد کے حصول کے لیے صرف اسلحے کی جانب نگاہ نہ کی جائے بل کہ ہر وہ ممکن راستے اختیار کیے جائیں کہ جن سے ہم ملک پر ہونے والے بیرونی خطرات کو کم سے کم کر سکیں تا کہ ملک کی دولت کو بچا کر ہم اسے عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کریں۔

حج کمیٹی میں نہیں، سعودی نظامِ حج میں بھی اِصلاحات ضروری

حج اور عمرے کے ویزے کے لیے سعودی اجازت یافتہ ٹریول ایجنٹ کی شرط لوگوں کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہے

۲۰۰۰ء میں اللہ نے مجھے پہلا حج کرنے کی توفیق عطا کی۔ اس میں شک نہیں کہ ایک چھوٹے سے رقبے میں بیس پچیس لاکھ انسانوں کے لیے عارضی قیام کی سہولت فراہم کرنا خاصا مشکل ہے، لیکن موجودہ ترقی یافتہ دور میں اسے بہتر سے بہتر بنانے کی طرف سنجیدہ کوشش نہ کرنا قابلِ مواخذہ ضرور ہے۔ ویسے تو حج کے موانع ومشکلات کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیے، لیکن میرے خیال میں اگر تذکرۂ مشکلات کے پس منظر میں مقصود اصلاحات و تدارکات ہوں تو معیوب نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ حجِ بیت اللہ اور زیارتِ مدینہ سے واپسی پر مَیں نے ''اصلاحاتِ حج کانفرنس'' کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون پریس کے حوالے کیا تھا جو کئی مذہبی رسائل وجرائد میں شائع ہوا۔ مراسمِ حج میں پیش آنے والے مسائل کے ذکر کے بعد میں نے کئی تجاویز پیش کی تھیں۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ منیٰ، مزدلفہ، عرفات اور مدینہ شریف کے درمیان میٹرو ریلوے کی تعمیر ہوجائے تو حجاج کی تقریباً نصف پریشانیوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اللہ کا لاکھوں احسان کہ انتظامیہ نے حال ہی میں مقاماتِ حج کے درمیان میٹرو ریلوے کے منصوبے کا معتدبہ حصہ مکمل کرلیا ہے۔ میں یہ بات کہنے کی جرأت تو اپنے اندر نہیں پاتا کہ میری تجویز پر میٹرو ریلوے کی تعمیر ہوئی ہے، لیکن اتنا تو بہ ہر حال کہہ سکتا ہوں کہ میری دلی تمناؤں کو بالآخر غیب سے سرفرازی کا شرف نصیب ہو ہی گیا۔

مجھے یاد آیا کہ لیبیا کے زمانہ طالب علمی میں ہندوستان لوٹتے ہوئے ۱۹۹۲ء میں پہلی

بار میری نگاہیں گنبدِ خضریٰ کی زیارت سے شادکام ہوئی تھیں۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ رُخِ قبلہ کے جانب مخالف سے متصل ساری آبادیاں کہیں اور منتقل کردی گئی ہیں۔ بلاشبہ یہ اقدام قابلِ تحسین تھا کہ سڑک کے بعد لق ودق کشادہ میدان اور پھر مسجد نبوی کی بلند و بالا عمارت بڑی ہی جاذبِ نظر دکھائی دیتی تھی، لیکن چند سالوں کے بعد جب حاضری ہوئی تو یہ دیکھ کر حد درجہ افسوس ہوا کہ قدیم آبادیوں کو جبراً منتقل کرکے کھلی جگہ پر بڑے بڑے فلک بوس ہوٹل بنادیے گئے ہیں۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ پہلے سڑک ہی سے مسجد نبوی کی پُرشکوہ عمارت کی جو دھمک دلوں میں محسوس ہوتی تھی، وہ اب ہوٹلوں کی زرق برق شعاؤں میں گم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان ہوٹلوں کی زمینی منزلوں میں دکانوں کی قطاریں بنادی گئی ہیں۔ یعنی اگر آپ اپنے مستقر سے زیارتِ مرقدِ انور ﷺ یا مسجد نبوی میں ادائیگی نماز کے لیے نکلیں تو دکانوں کی پُرکشش رنگینیاں آپ کے خیال کی یکسوئی کو کہیں اور پہنچادیں گی۔ اے کاش! مسجد نبوی کے سامنے کے حصے خالی اور پُرسکون رکھے جاتے، نیز بازاروں کو جہاں تک ممکن ہو دور رکھا جاتا تو یقین جانیے کہ اطراف وجوانب کی فضاؤں میں ''روحانیت'' کی عطر بیزیاں مزید بڑھ جاتیں۔ پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ زائرین کی عام ضرورتوں کے حوالے سے دکانیں ہوتیں تو ایک بات تھی، لیکن زیورات، گھڑی اور نئی ایجادات کی دکانوں کا حرمِ نبوی ﷺ کے اطراف میں کیا کام؟

آپ اس پس منظر میں اطرافِ مکہ پر نگاہ ڈالیں تو صورتِ حال مزید تشویشناک دکھائی دیتی ہے۔ مدینہ کی طرح مکے میں تو زمین وسیع وعریض نہیں، اس کے باوجود یہاں دکانوں کی بھرمار ہے۔ آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ دکانوں کی وجہ سے حرم کے قریب بلاوجہ کا شور وہنگامہ ہوتا رہتا ہے، جب کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی مرکزی عبادت گاہ ہونے کی حیثیت سے اسے سب سے زیادہ پُرسکون ہونا چاہیے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ خانہ کعبہ کے اردگرد گنجائش سے زیادہ ٹریفک پیچیدہ مسئلہ بنا رہتا ہے، جس میں دورانِ حج مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ بغیر کسی ادنیٰ شک و شبہے کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مسئلہ ٹریفک کے اس اضافے میں دکانوں کے ذمہ

داروں، خادموں اور تجارتی سامان ڈھونے والی گاڑیوں کا بھی اچھا خاصا حصہ ہوتا ہے۔
مان لیا کہ حجاج و معتمرین کی نقل و حرکت کے لیے سواریوں کا ہونا ناگزیر ہے، لیکن کیا غیر ضروری دکانوں کی موجودگی پر قدغن لگا کر ایک بہت بڑے مسئلے کو حل نہیں کیا جاسکتا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فیشن، زیور، گھڑی، ٹیپ ریکارڈ، آرائش و زیبائش کی دکانیں آخر کس کے مشورے سے کھولی گئیں ہیں؟ اے کاش! ارباب اقتدار اطراف حرمین شریفین میں صرف کھانے پینے کے ہوٹل، دوا علاج کی ڈسپنسریاں اور مسافروں کے عام استعمال کی دکانوں ہی کی اجازت دیتے، تو ظاہری اعتبار سے بھی حرمین شریفین کی عظمت و افتخار میں بے پایاں اضافہ ہوجاتا۔

اسی طرح نہ جانے کس مقصد کے پیش نظر سعودی حکومت نے حج و عمرے کے ویزے کے لیے اپنے سند یافتہ ایجنٹ کی شرط لگادی ہے۔ پہلے لوگ مفت میں سعودی سفارت خانے سے ویزے لیتے تھے اور اپنے طور پر رہائش اور خورونوش کا بندوبست کرلیا کرتے تھے، لیکن جب سے ایجنٹ کے وسیلے کے بغیر ویزے نہ لگانے کی پالیسی اپنائی گئی ہے، حج و عمرے کے لیے جانے والے لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی ایجنٹوں کے ظالمانہ پنجوں میں بری طرح پھنس جاتے ہیں، جو کسی ماہر قصاب کی طرح لوگوں کی کھال کھینچنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اگر شک ہو تو مثال حاضر کیے دیتا ہوں۔ آپ انٹرنیٹ کے ذریعہ اچھے سے اچھے ہوٹلوں میں اپنے قیام و طعام کا بندوبست کیجیے اور مدینہ، مکہ نیز جدہ ائرپورٹ کے درمیان آمد و رفت کا ایک متوسط کرایہ شامل کرلیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ کسی ایجنٹ کے توسط سے عمرے یا حج کا پیکج لینے کے مقابلے میں آپ کے اخراجات میں تقریباً آدھے کا فرق واقع ہوجائے گا۔

ذرا غور کیجیے کہ ایجنٹ کی شرط لگا کر سعودی حکومت نے کس کو نقصان اٹھانے پر مجبور کیا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا کے کسی ملک میں وہاں کے ویزے لینے کے لیے ایجنٹوں کے وسیلے کی شرط نافذ نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کے مرکزی مقام کی زیارت کے لیے غیر ضروری شرائط کی پابندی بڑی عجیب سی لگتی ہے۔

یہ انٹرنیٹ کا دور ہے، آج کل دنیا کے ایک حصے میں بیٹھ کر دوسرے ممالک کے اسفار سے متعلق ضروری سہولیات کے حصول کو واقعی بنایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ بجا طور پر ہوسکتا ہے کہ حکومت سعودی عرب حج و عمرے کے ویزے کے لیے درخواست گزار سے آمد و رفت کے ٹکٹ اور حرمین شریفین میں قیام و طعام کے ثبوت کا مطالبہ کرے۔ اس طرح انتظامیہ کو اس بات کا یقین ہوجائے گا کہ جانے والا اپنے اخراجات کے لیے اس کے سر نہیں پڑے گا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کسی انسان کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا کوئی اچھی بات ہے، لیکن کیا کریں کہ موجودہ دور میں ضرورت مندوں کا استغلال اب معیوب نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایجنٹ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ حج و عمرہ کے خواہش مندوں کو بہرحال ہماری چوکھٹ پر آنا ہی پڑے گا، تو وہ بھی بڑی دانش مندی کے ساتھ اپنے شیشے میں اتار کر اچھی خاصی موٹی رقم اینٹھ لیتے ہیں۔ عرصہ دراز سے لوگ حج و عمرے کے لیے ٹریول ایجنٹوں کی خدمات حاصل کرتے رہے ہیں، لیکن اس وقت چوں کہ سفارت خانے بغیر ایجنٹ کے بھی ویزے جاری کردیا کرتے تھے، اس لیے لوٹ کھسوٹ اس قدر آسمان پر نہ تھی۔

صاحبو! اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالیں تو یہ بات آفتابِ نیم روز کی طرح عیاں ہوجائے گی کہ اسلام ہمیشہ جہاں تک ممکن ہو آسانیوں کو فروغ دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے بڑی وضاحت کے ساتھ فرمایا: تم لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات پیدا نہ کرو! رسول اکرم ﷺ کی مندرجہ بالا ہدایت کا تقاضا یہ ہے کہ حرمین شریفین جانے والوں کے لیے سہولتیں پیدا کی جائیں اور انھیں کسی اعتبار سے مشکلات میں نہ ڈالا جائے۔

حالیہ انتخاب کے پس منظر میں مسلمانوں کی طاقت کا اِعتراف

پُر عزم وزیر اعلیٰ جناب اکھلیش یادو سے توقعات ضرور رکھیں، لیکن اعتدال کے ساتھ

حالیہ صوبائی الیکشن کے نتیجے میں اتر پردیش کی کرسی اقتدار پر ایک پر عزم جواں سال لیڈر جناب اکھلیش یادو مسند نشیں ہو چکے ہیں اور انھوں نے یوپی میں اب تک کے سب سے کم عمر وزیر اعلیٰ ہونے کا شرف بھی حاصل کر لیا ہے۔ ویسے تو سیاست انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملی ہے، لیکن وہ بہت زیادہ اخبارات کی سرخیوں میں نہیں دیکھے گئے اور نہ ہی کسی قابل ذکر ملی مسئلے میں ہی ان کی آواز کی گونج سنائی دی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب تک خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو کسی انقلابی سرگرمیوں کے لیے تیار کر رہے تھے اور جیسے ہی مناسب وقت ہاتھ آیا پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ میدان میں کود پڑے۔ مایاوتی کے دور حکومت سے لوگ اس قدر نالاں تھے کہ موجودہ الیکشن میں لوگوں نے اپنے حق رائے دہندگی کا استعمال کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر سماج وادی پارٹی کو اکثریت سے کام یاب کیا۔ اسی کے ساتھ میڈیا کی رپورٹ کے مطابق ووٹنگ میں حصہ لینے والوں کا فی صد بھی حیرت انگیز طور پر ماضی سے بہت زیادہ رہا۔ ووٹنگ میں لوگوں کی غیر معمولی دل چسپی بتاتی ہے کہ جب وہ بہت زیادہ ستائے ہوئے ہوتے ہیں تو بڑی بے چینی کے ساتھ تبدیلی کا انتظار بھی کرتے ہیں اور کثیر تعداد میں سڑکوں پر نکل کر اپنے بنیادی حقوق کا استعمال بھی کرتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نگاہ رہنی چاہیے کہ مایاوتی نے اپنی ہزیمت آمیز شکست کے پس منظر میں ایک نہیں دوبار بڑے ہی صاف لفظوں میں کہا ہے کہ سماج وادی پارٹی کی فقید المثال کام یابی میں اتر پردیش کے مسلم ووٹروں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگر یہ

بات روا روی میں کہی گئی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا، لیکن جب کہ انھوں نے اس کا تذکرہ دوبار کیا ہے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے حقیقت پر مبنی خیال کریں۔ ویسے تو سیاسی پارٹیوں کو مسلم ووٹ کی اہمیت کا احساس ہمیشہ سے ہی رہا ہے، لیکن غالباً یہ پہلا موقع ہے جب کسی بڑی پارٹی کی سرکردہ لیڈر نے بغیر کسی دباؤ کے یہ قبول کیا ہے کہ مسلمان اگر چاہیں تو ہوا کا رخ بدل سکتے ہیں۔ یہ اعتراف حقیقت ہم مسلمانوں کے لیے اس حیثیت سے بھی بڑا قیمتی ہے کہ یہ اپنوں کی زبان سے نہیں ہے، بل کہ اس کی زبان سے ہے جو ہمارا ہم مذہب نہیں ہے۔ افسوس کہ ملک کے حالات پر عقابی نگاہ رکھنے والے مسلم دانش ور عرصہ دراز سے چیخ رہے ہیں کہ مسلمانوں کو ووٹنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے کر اپنی اجتماعی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہیے، لیکن ہم ہیں کہ اپنی دنیا میں مست، بس عیش و عشرت بھرے چند لمحات ہاتھ آگئے اور ہم نے اسے بہت بڑی کام یابی سمجھ لیا۔ بہت ممکن ہے کہ متوسط درجے کی آرام دہ زندگی انفرادی اعتبار سے تو کام یابی کہی جائے، لیکن ملی پس منظر میں یہ کسی طور کام یابی کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ جب تک مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کے حل کی جانب پیش قدمی نہ کی جائے، ملت اسلامیہ مستحکم نہیں ہو سکتی اور جب تک ملی اعتبار سے مسلمانوں کا نرخ اونچا نہیں ہوگا ہمارا مستقبل محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا۔

مَیں یہ نہیں کہتا کہ اس سے قبل مسلمانوں نے ووٹنگ میں فعال کردار ادا نہیں کیا ہے، لیکن مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ ایسے مواقع پر مسلمانوں کی سیاسی طاقت ٹکڑیوں میں بٹ گئی اور فائدہ غیروں کو پہنچ گیا۔ بہ ہر کیف جس طرح اس بار مسلمانوں نے اپنی قیمت کا اعتراف غیروں سے کرایا ہے، اسے مستقبل میں بھی قائم رکھیں تو اتر پردیش کے سیاسی افق پر مسلمانوں کے لیے عزت و افتخار کا سورج یقینی طور پر طلوع ہوگا۔

ذرا غور کیجیے کہ مسلمانوں نے اجتماعی طور پر شعور و آگہی کا ثبوت دیا تو اسمبلی کی کل ۴۰۳ نشستوں میں سے تقریباً ۷۰ مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ اسے کم نہ سمجھیے، گو وزارت عظمیٰ کا قلم دان ہمارے ہاتھ میں نہیں، لیکن یہی کیا کم ہے کہ کل تک جسے سیاسی اکھاڑے کے حاشیہ پر رکھا جاتا تھا، آج سارے چمنستان کی تزئین و آرائش اسی کی رہین منت ہے۔ یہ ہم سبھوں

کے لیے علامتی چراغ کے مترادف ہے کہ جسے اگر ہوا کے جھونکوں، خود غرضی کے طوفانوں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھا جائے تو اسی روشنی سے کل سینکڑوں چراغ جلائے جاسکتے ہیں اور پھر ہماری تیرہ و تاریک دنیا صبح امید کی نئی کرن سے آشنا ہوسکتی ہے۔ خیال رہے کہ دنیا کی کسی قوم کو راتوں رات زمین سے آسمان کی بلندی پر محو پرواز ہونے کے مواقع میسر نہیں آتے، بل کہ تاریخ بتاتی ہے کہ قوم کے عزو افتخار، کام یابی و کام رانی اور فتح و نصرت کے پیچھے برسوں کی مسلسل محنت درکار ہوتی ہے۔ سب سے پہلے قوم جاگتی ہے، پھر اپنے مسائل کے تدارک کے لیے سنجیدگی کے ساتھ لائحہ عمل مرتب کرتی ہے اور پھر حوصلہ وامنگ، جذبہ وخلوص اور صبر وتحمل کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑتی ہے، تب کہیں جاکے قوم کام یابی و کام رانی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر یہ کہے دیتا ہوں کہ اتر پردیش میں مسلمان ابھی پہلے مرحلے میں داخل ہوئے ہیں، لہٰذا اسے منزل سمجھنے کی غلطی نہ کی جائے، بل کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دانش مندی کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے ہم دوسرے اور پھر تیسرے مرحلے میں داخل ہوجائیں۔

یہاں ایک بات اہمیت سے خالی نہیں کہ انسان بسا اوقات کسی سے بیزار ہوجائے تو وہ اس کے مدمقابل کی حمایت کرتا ہے اور اس کی کام یابی کے بعد پھر اپنے سارے مسائل کے حل کے لیے اس سے توقعات بھی رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم موجودہ حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات بہت واضح نظر آتی ہے کہ مایاوتی حکومت میں مسلمانوں کے مسائل سے پہلوتہی کی پالیسی اپنائے جانے کی وجہ سے عمومی طور پر مسلمان ناراض تھے۔ ایسے ماحول میں ووٹنگ ہوئی تو سماج وادی پارٹی کو بہترین متبادل سمجھ کر مسلمانوں نے اس کی حمایت کردی، جس کے نتیجے میں سماج وادی پارٹی کو توقع سے زیادہ بڑی کام یابی حاصل ہوگئی۔ اب منطقی طور پر مسلمان اسے اپنی فتح سمجھتے ہوئے اپنے جملہ مسائل کے حل کے لیے جواں سال وزیر اعلیٰ جناب اکھلیش یادو کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جسے اپنے قیمتی ووٹ دے کر فتح یاب کیا ہے، اس سے اپنے مسائل کے حل کی امید رکھنا کوئی عیب کی بات ہے، بل کہ مدعا صرف اس قدر ہے کہ مسلمان جناب

اکھلیش یادو سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہ کرلیں۔ یہ خیال رہے کہ وہ پوری ریاست کے وزیر اعلیٰ ہیں اور انھیں ہر مذہب وملت کے ماننے والوں کے مسائل حل کرنے کی جانب توجہ رکھنی ہے، لہٰذا ہمیں ان سے اپنے توقعات کی وابستگی میں بھی اعتدال ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا اور ہم نے ان سے حد سے زیادہ توقعات رکھ لیں، تو یہ نہ صرف ان کے حق میں بہتر نہ ہوگا، بل کہ ملّی اعتبار سے بھی ہمارے لیے نقصان دہ ہوجائے گا۔ وہ یوں کہ جب وہ ہمارے توقعات کما حقہ پورا نہ کرسکیں گے تو ظاہر ہے لوگ ان سے ناراض ہوجائیں گے اور وہی غیض وغضب جو بہوجن سماج پارٹی کے لیے اس بار لوگوں کے دلوں میں تھا، آئندہ الیکشن کے موقع پر بعینہٖ اسی غم وغصہ کا شکار سماج وادی پارٹی کو ہونا پڑے گا۔ یہ تو رہی وہ بات جو بہت واضح تھی۔

اب ذرا دیکھیے کہ کسی سے حد سے زیادہ توقعات رکھنا ہمارے لیے نقصان دہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ موجودہ سماج وادی پارٹی کی جیت کو مسلمان کسی حد تک اپنی فتح ونصرت بھی سمجھ رہے ہیں۔ اب جب کہ اپنی جیت کے باوجود ہمیں اپنی توقعات کے مطابق فائدہ نہ پہنچے تو دل ٹوٹے گا، حوصلہ پست ہوگا اور یہ احساس پیدا ہوجائے گا کہ ہماری کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ پھر اس طرح کے کرب ناک تجربے کا اثر یہ ہوگا کہ آئندہ ووٹنگ کے موقع پر ہم چاہتے ہوئے بھی نشاط وامنگ کے ساتھ سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے سے گریزاں رہیں گے۔ اور مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ملت کا وہ نقصان کہلائے گا کہ جس کے مساوی شاید ہی کوئی خسران ہو۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ان سے توقعات ضرور رکھیں لیکن اعتدال کے ساتھ۔

صرف ریزرویشن ہمارے روشن مستقبل کی ضمانت نہیں

بہت زیادہ شکوے انسان کے اندر چھپی ہوئی طبعی صلاحیتوں کی نشوونما متاثر کرتے ہیں

مرکزی حکومت نے اقلیتوں کے لیے ریزرویشن کا بل پاس کر کے مسلمانوں کو لبھانے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے سرکردہ عمائدین نے بھی اس بل پر بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایک طرف فرقہ پرست جماعتیں اس کی مخالفت میں کمر بستہ ہوگئی ہیں، وہیں دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ اظہارِ ہم دردی کے بلند بانگ دعوے کرنے والی سیاسی جماعتوں نے بھی اسے ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ یہ الگ بات کہ فرقہ پرست عناصر مسلم دشمنی کے جذبے میں مخالفت کر رہے ہیں اور دوسری پارٹیاں ''عنایاتِ مزید'' کے لیے صدائے احتجاج بلند کر رہی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سرکاری ملازمتوں، تعلیمی اداروں اور دیگر محکموں میں ریزرویشن سے بعض مسلمانوں کو ترقی کے مواقع ضرور میسر آئیں گے، لیکن مسلمانوں کی اکثریت پھر بھی پس ماندگی کے دلدل میں پھنسی رہے گی۔ یہ نتیجہ دو جمع دو چار کی طرح اعداد و شمار کی بنیاد پر بہ آسانی نکالا جاسکتا ہے۔ یقین نہ آئے تو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی مسلم آبادی کے حوالے سے مردم شماری پر ایک نگاہ ڈالیے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۲۵ فی صدی ہے۔ اس طرح ممکنہ چار فی صد ریزرویشن سے کس طرح مسلمانوں کی اکثریت کو ترقی کی راہ پر گام زن کیا جاسکتا ہے؟ اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ یہ چار فی صد ریزرویشن سارا کا سارا صرف مسلمانوں

کے لیے نہیں ہے، بل کہ اس بل کے قانونی لب و لہجے کے مطابق اس میں ملک کی دوسری اقلیتیں بھی شامل ہیں جن میں سکھ، عیسائی، بودھسٹ وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

ماضی کے تلخ تجربات کی روشنی میں یہ خدشہ بھی بے جا نہیں کہ ممکنہ بل کے پاس ہوجانے کے بعد عملی نفاذ کے دوران مسلم دشمنی کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا فائدہ دوسروں کو پہنچا دیا جائے، کیوں کہ اس سے قبل بھی ناانصافی اور بے اعتنائی کے جو کرب ناک واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں، ان کے تانے بانے ''سرکاری اداروں'' سے ہی ملتے ہیں۔ اور بات معقول بھی ہے کہ نجی اداروں سے شکوہ کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟ یہ حق تو بہر حال انھیں حاصل ہے کہ وہ اپنے مفاد میں جسے چاہیں خدمت کا موقع عطا کریں۔ ہمیں بے اعتنائی کا جو بھی شکوہ ہے وہ تو سرکاری محکموں سے ہی ہے اور جب ان کی اصلاح نہ ہوگی تو آخر کیوں کر مسلمانوں کا بھلا ہو سکے گا۔

اس منطقی نتیجے کا اظہار یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ مثال کے طور پر پہلے کسی محکمے کی جانب سے کسی عہدے پر بحالی کے اشتہار شائع ہوئے اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے فرقے سے تعلق رکھنے والے امیدوار بھی متمنی ہوں تو مسلمانوں کو دوسروں پر ترجیح دے دی گئی۔ اب ذرا ریزرویشن بل کے نفاذ کے بعد کی ممکنہ حالت پر غور کیجیے۔ اس بل کے دفعات کی رو سے اب بھی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسری اقلیتوں کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ اس بل کے پاس ہوجانے کے باوجود بے انصافی کا وہی پرانا پیمانہ نہیں اپنایا جائے گا کہ پہلے اور اب میں صرف اس قدر فرق ہے کہ پہلے مسلمانوں کو اکثریت کی وجہ سے بے اعتنائی کا سامنا تھا اور اب دوسری اقلیتوں کی وجہ سے۔ میں نہیں سمجھتا کہ حالات کے اس جزوی فرق سے مسلمانوں کی بنیادی حالت میں کوئی واضح ترقی کے آثار دکھائی دے سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ریزرویشن بل سے مستقبل میں مسلمانوں کے اقتصادی و معاشی حالات میں کسی کرشماتی تبدیلی کی امید نہیں رکھنا چاہیے۔

موضوعِ بحث کے حوالے سے یہ حقیقت بھی پیش نگاہ رہے کہ عصرِ جدید میں

اقتصادیات کی کنجی اب تیزی کے ساتھ سرکاری گرفت سے نکل کر نجی ہاتھوں میں جا رہی ہے، بل کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دنیا میں بعض ایسی بھی نجی کمپنیاں ہیں جن کا بجٹ چند ممالک کے جملہ بجٹ سے بھی زیادہ ہے۔ میرے کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ سرکاری اداروں پر رفتہ رفتہ انحصار کم ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کو بھی اپنے مستقبل کے حوالے سے فکر و نظر کے زاویے بدل لینے چاہییں۔ دنیا بھر کے نجی اداروں کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے اپنے ادارے کے لیے منتخب کریں جو ان کے مفاد کے لیے زیادہ سے زیادہ بہتر ہو۔ اس حوالے سے وہ اس بات میں کوئی تمیز نہیں کرتے کہ کون اپنا ہے اور کون پرایا؟ اگر غیر مسلم کمپنی کے مالک یہ محسوس کریں کہ کوئی مسلمان اپنی صلاحیت اور قابلیت سے اسے زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے تو وہ اسے نوکری دینے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ میں ایسے کتنے ہی لوگوں کو جانتا ہوں جنھیں غیروں کی کمپنیوں نے نہ صرف اچھے عہدوں پر فائز کیا بل کہ ان کی ناز برداری بھی کرتے رہے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک ایسے نوجوان سے میری ملاقات امریکہ کے شہر حنبل میں ہوئی جنھیں ایک غیر مسلم کمپنی نے کمال ناز برداری کے ساتھ اپنے یہاں نوکری کی پیش کش کی، جب کہ وہ انگلینڈ کی کسی کمپنی میں ملازمت کر رہے تھے۔ وہ نوجوان مجھ سے کہنے لگے کہ میری ساری شرطیں انھوں نے قبول کیں اور میرا پورا سامان انگلینڈ سے امریکہ منتقل کیا۔ مجھے انھوں نے رہائش کی سہولت بھی دی۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں آپ کو دنیا میں مل جائیں گی۔

صاحبو! اتنی تمہید کے بعد یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں حکومت سے مطالبات کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی کوششوں کو بھی جاری رکھنا چاہیے۔ اور یہ نہ بھولنا چاہیے کہ حکومت سے ہمیں خواہ کتنی ہی مراعات کیوں نہ مل جائیں جب تک ہم خود ذاتی طور پر جدو جہد نہ کریں ہمارا مستقبل روشن و تابناک نہیں ہو سکتا۔ یہ بات یاد رکھی جائے کہ اگر ہمارے اور غیروں کے درمیان فرق انیس بیس کا ہو تو بہت ممکن ہے کہ ہمارے ساتھ زیادتی کی جائے، لیکن جب اس فرق کا تناسب بہت زیادہ بڑھ جائے تو ہمیں نظر انداز کرنا غیروں کے لیے آسان نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے یہاں فطری صلاحیتوں کی کمی نہیں،

بس کمی ہے تو حوصلہ اور جذبہ و نشاط کی۔ اسی لیے میں کبھی کبھی کہتا ہوں کہ بہت زیادہ شکوہ کرتے رہنے سے ہمارے اندر چھپی ہوئی طبعی صلاحیتوں کی بہتر انداز میں نشو و نما نہیں ہو پاتی۔ اسی طرح نفسیاتی اعتبار سے یہ بھی مناسب نہیں کہ ہم بہت زیادہ اپنے ساتھ ہونے والی بے اعتنائیوں کا تذکرہ کریں۔ اس طرح دھیرے دھیرے ہم خود اپنی ذاتی نشاط و اُمنگ سے بے اعتنائی برتنے لگتے ہیں۔ اور پھر اسے ہی ہم ہر محاذ پر اپنی تنزلی، پستی اور زبوں حالی کے لیے عذرِ معقول سمجھ بیٹھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب ہم اپنی ناکامی کو دوسروں کے سر ڈالنے کے عادی ہو جائیں تو پھر خود اپنی کم زوریوں کو ٹٹولنے کا موقع کیوں کر میسر آئے گا؟ اور جب ہم خود اپنی کم زوریوں سے واقف نہ ہوں گے تو پھر ان کی اصلاح و درستگی کی تحریک کیوں کر شروع ہو سکے گی؟ اس لیے ہمیں سب سے پہلے مایوسی کے غارِ عمیق سے باہر نکلنا ہوگا، اپنے اندر حوصلہ افزا جذبات کی آب یاری کرنی ہوگی اور صبح کی اگلی کرن کے ساتھ ہی بہتر مستقبل کی تلاش میں جدوجہد کا آغاز کرنا ہوگا، پھر یقینی طور پر کام یابی ہمارے قدم چومے گی۔

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں اجالا کر کے چھوڑوں گا

عالم اسلام

دُنیا کی آدھی مسلم آبادی فقہِ حنفی پر عمل کرتی ہے

ساری دنیا میں ۴۵.۵٪ مسلمان فقہِ حنفی، ۲۸٪ مسلمان فقہ شافعی، ۱۵٪ فقہ مالکی اور ۲٪ فقہ حنبلی کے مطابق اپنے شب وروز گزار رہے ہیں

مغربی ممالک مستقبل کا لائحہ عمل بنانے سے قبل ماضی کے تجربات بھی پیش نگاہ رکھتے ہیں اور حالاتِ حاضرہ کے نشیب وفراز بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں کسی نہ کسی موضوع پر آئے دن سروے ہوتے رہتے ہیں تاکہ حالات کا صحیح ادراک ہوسکے۔ اب تو اس مقصد کے لیے دنیا میں کئی ایک ایجنسیاں بھی معرض وجود میں آچکی ہیں، جو فون، انٹرنیٹ اور دروازے دروازے پہنچ کر منتخب موضوع کے حوالے سے لوگوں کے مشورے ری کارڈ کرتی ہیں۔ پھر انہیں ری کارڈ کے سہارے وہ ایک عام نتیجہ اخذ کر کے دنیا کے سامنے پیش کردیتی ہیں۔

اسی طرح کا ایک سروے ابھی جارج واشنگٹن یونی ورسٹی نے کرایا ہے۔ مسلمانوں کے حوالے سے مختلف محاذ پر ایک عام رائے معلوم کرنے کی غرض سے کیے گئے اس سروے میں دنیا میں ایسی شخصیتوں کی فہرست بنائی گئی جو دنیا کے مسلمانوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا یہ کہ لوگ بڑی تعداد میں ان کے افکار وخیالات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے سیاسی، مذہبی، سماجی اور دیگر میدانوں میں کام کرنے والے مسلمانوں کا جائزہ لیتے ہوئے چیدہ چیدہ شخصیات کی درجہ بندی کی ہے، جسے انھوں نے **(The 500 Most Influential Muslims, 2011,Page)** کا نام دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یونی ورسٹی کی نگرانی میں پوری دنیا کے مسلمانوں کا ایک جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی کہ دنیا کے مسلمان فقہی پس منظر میں کس مسلک

سے منسلک ہیں۔ اس عمل میں ماہرین کی ایک ٹیم مختص کی گئی اور پھر مسلسل کئی ماہ کے بعد رپورٹ منظر عام پر آگئی۔

اس رپورٹ کے مطابق ساری دنیا میں ۴۵.۵٪ مسلمان فقہ حنفی پر عمل کرتے ہیں، ۲۸٪ مسلمان فقہ شافعی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، ۱۵٪ فقہ مالکی کے مطابق اور ۲٪ فقہ حنبلی کے مطابق اپنے شب وروز گزار رہے ہیں۔ اس طرح یہ کل تعداد ۹۰.۵۰٪ بن جاتی ہے۔ باقی بچے ۹.۵۰٪ مسلمانوں میں ہر وہ شخص شامل کیا جاسکتا ہے جو بہ نام مسلم اس دنیا میں رہ رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسے منطقی طور پر ایک ممکنہ تخمینہ ہی کہا جائے گا اور تخمینہ ہی بھی علم قطعی کے قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس منطقی تجزیہ کے باوجود ہمیں یہ بہ ہر حال تسلیم کرلینا چاہیے کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کی اکثریت فقہ حنفی ہی کے زلف کی اسیر ہے۔

یہ بات اس لیے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دیگر مشہور ومعروف تینوں مسالک کے مقابلے میں فقہ حنفی کے ماننے والوں کے فی صد کا تناسب اس قدر زیادہ ہے کہ احتیاطی تدابیر کے باوجود بہ ہر حال اسے ہی فوقیت حاصل رہے گی۔ مسالک کے درمیان فی صد کا فرق اگر قدرے آس پاس ہوتا تو غیر جانب دار شخص کے لیے کسی ایک کو ترجیح دینا مشکل ضرور ہوتا، لیکن یہاں جو فرق ہے وہ دوگنا، سہ گنا اور چہار گنا سے بھی زیادہ ہے۔ اس لیے ایک غیر جانب دار شخص کے لیے بھی اس واضح وبین فرق سے اعراض کرنا آسان نہ ہوگا۔

اور یہ رپورٹ توقعات کے عین مطابق بھی ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ تاریخ اسلامی کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فقہی ضابطوں کو دلائل وبراہین سے مزین کرتے ہوئے عوام کی سہولت کے لیے ایک منظم ڈھنگ سے پیش کیا ہے تاکہ کم سے کم وقت میں پورے موضوع سے متعلق ساری جہتیں قاری کے سامنے آجائیں۔ پہلے ہوتا یہ تھا کہ جب مسائل پیدا ہوجائیں تو ان کے حل دریافت کرنے کی کوششیں کی جاتی تھیں، لیکن آپ نے مفروضہ مسائل تیار کرکے ان کے حل تلاش کرنے اور انھیں قلم بند کرنے کی طرف توجہ فرمائی۔

اسی کے ساتھ یہ مغالطہ نہ رہے کہ فقہ حنفی شاید تنہا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تیار کردہ ہے، بل کہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب آپ نے فقہ کی تدوین کا آغاز کیا تو اس وقت کے اجلہ محدثین،

ماہر فقہا، معتمد مفسرین اور اصحاب حل وعقد کی ایک ٹیم بنائی جس کے ممبروں کی کل تعداد چالیس تھی۔

مشہور دانش ور ڈاکٹر حمید اللہ کہتے ہیں کہ

"امام اعظم ابو حنیفہ نے ایک کارنامہ انجام دیا جو اسلامی قانون کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم اور یادگار کارنامہ ہے۔ اس زمانے میں امام مالک، امام اوزاعی وغیرہ بڑے بڑے فقیہ موجود تھے۔ انھوں نے کتابیں لکھیں لیکن ان کی کوششیں انفرادی تھیں۔ امام ابو حنیفہ نے سوچا کہ انفرادی کوشش کی جگہ اسلامی قانون کی تدوین اگر اجتماعی طور پر کی جائے تو بہتر ہوگا۔ چناں چہ انھوں نے اپنے بہت سے شاگردوں میں سے چالیس ماہرین قانون منتخب کر کے ایک اکیڈمی قائم کی۔ انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا کہ جو لوگ قانون کے علاوہ دیگر علوم اور معاملات کے ماہر ہوں انھیں بھی اکیڈمی کا رکن بنایا جائے۔ غرض مختلف صلاحیتوں کے ماہرین کو اس اکیڈمی میں جمع کیا گیا۔"

(خطباتِ بہاول پور، ص:۸۵)

اس تاریخی اکیڈمی کے چالیس اراکین کے نام یہ ہیں:

امام زفر بن ہذیل، امام مالک بن مغول، امام داؤد طائی، امام مندل بن علی، امام نضر بن عبد الکریم، امام عمرو بن میمون، امام حبان بن علی، امام ابو عصمہ نوح، امام زہیر بن معاویہ، امام قاسم بن معین، امام حماد بن ابو حنیفہ، امام ہیاج بن بسطام، امام شریک بن عبد اللہ، امام عافیہ بن یزید، امام عبد اللہ بن مبارک، امام قاضی ابو یوسف، امام ابو محمد نوح نخعی، امام ہیثم بن بشیر السلمی، امام یحییٰ بن زکریا، امام فضیل بن عیاض، امام اسد بن عمرو، امام محمد بن الحسن، امام علی ابن مسہر، امام ابو یوسف بن خالد، امام عبد اللہ بن ادریس، امام فضل بن موسیٰ، امام علی بن ظبیان، امام حفص بن غیاث، امام وکیع بن الجراح، امام ہشام بن یوسف، امام یحییٰ سعید القطان، امام شعیب بن اسحاق، امام حفص بن عبد الرحمٰن، امام ابو مطیع بلخی، امام خالد بن سلیمان، امام حسن بن زیاد، امام یزید بن ہارون، امام عبد الرزاق بن ہمام، امام ابو

عاصم بن ضحاک، امام مکی بن ابراہیم علیہم الرحمۃ و الرضوان اجمعین۔

(الجواھر المضیۃ: شیخ عبد القادر قرشی)

مندرجہ بالا علمائے کرام کی حیات طیبہ پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ یہ سب کے سب اپنے عہد کے جلیل القدر، قابل اعتماد اور فکر و فن کے اساتذہ رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ فقہ حنفی کی تدوین کا عہد سرکار دو عالم ﷺ کے عصر ظاہری سے سب سے زیادہ قریب بھی ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا عین حقیقت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے فیضان و کرم کا جو علمی سرمایہ اس وقت موجود تھا وہ عہد بعید کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابل اعتماد اور بہتر حالت میں تھا۔

اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ دیگر فقہی مذاہب کے ائمہ بالواسطہ یا بلا واسطہ امام اعظم ؓ کے شاگرد رہے ہیں۔ وہ یوں کہ امام شافعی ؓ امام محمد کے شاگرد تھے اور امام احمد بن حنبل ؓ امام ابو یوسف کے شاگرد رہے۔ جب کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ امام محمد اور امام ابو یوسف ؒ امام اعظم ؓ کے شاگرد تھے۔ اسی طرح امام مالک ؓ نے بھی امام اعظم ؓ سے کسب فیض کیا ہے۔ اس طرح ائمہ ثلاثہ کسی نہ کسی جہت سے امام اعظم ؓ کے شاگرد رہے۔ اسی طرح حدیث کی شہرۂ آفاق کتابیں صحاح ستہ کے مصنفین کو بھی امام اعظم ؓ سے بالواسطہ یا بلا واسطہ شاگرد ہونے کا شرف حاصل رہا۔ امام بخاری، امام مسلم اور امام ابو داؤد ؒ تو امام احمد بن حنبل ؓ کے شاگرد رہے، جب کہ امام ترمذی نے بخاری و مسلم سے اور امام نسائی نے امام ابو داؤد سے استفادہ کیا، یہی حال امام ابن ماجہ ؒ کا ہے۔ اس طرح گویا صحاحِ ستہ کے مصنفین بھی امامِ اعظم ؓ کے شاگرد ہوئے۔

صاحبو! ان ساری حقیقتوں کو دیکھتے ہوئے ضمیر پکار اٹھتا ہے کہ مندرجہ بالا سروے کے مطابق فقہ حنفی کے ماننے والے اگر دنیا میں کسی دوسرے ائمہ کے ماننے والوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں تو یہ صد فی صد صداقت پر مبنی ہے۔

اِسلام کی حقانیت کو بہ ہر حال تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے

انسان کے ذریعہ تشکیل شدہ ضابطہ آنے والے مستقبل کے ممکنہ تقاضے کا تخمینی حل ہے، جب کہ الٰہی ضابطہ مستقبل کے واقعی تقاضے کا یقینی حل

پچھلے ہفتے فرانس کی قومی اسمبلی میں بحث ومباحثہ کے بعد ایک بل پاس کیا گیا، جس کے ذریعہ ملک میں جسم فروشی پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ مذکورہ بالا بل کے مطابق جسم فروشی کے معاملے میں پکڑے گئے ملزم کو تین ہزار یورو تک جرمانے اور چھ ماہ قید کی سزا دی جائے گی۔

ماضی کے آئینے میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کریں تو یہ امر اچھی طرح آشکار ہو جائے گا کہ کل تک ''آزادی'' کے داعیوں نے ہی جسم فروشی کے دھندے کو کھلی چھوٹ دی تھی۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ انسان کو پوری آزادی کے ساتھ اس دنیا سے لطف اندوز ہونے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اسی لیے پوری شدت کے ساتھ ہر اس قانون کی مخالفت کی گئی جو انسان اور اس کی خواہشات کے درمیان رکاوٹ بن جائے۔ بہ ظاہر بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ کل تک جب اسلام ''جسم فروشی'' پر پابندی لگانے کی بات کرتا تھا تو یہی نام نہاد آزادی انسانیت کے دعوے دار اسے ''تنگ نظری'' اور ''قدامت پسندی'' سے تعبیر کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر اسلامی شریعت کا کھلے عام مذاق اڑایا جاتا تھا، بل کہ کبھی کبھی تو قرآن کریم بھی ان کے خلاف عقل وفراست طعن وتشنیع کا شکار بن جاتا تھا۔ مگر اب جب کہ جسم فروشی کے نقصانات دوپہر کی دھوپ کی طرح عیاں ہوگئے ہیں تو اس پر قدغن لگانے کے حوالے سے بل پاس کردیا گیا ہے۔

اسی طرح کی ایک مثال تین چار سال قبل میکسیکو میں دیکھی گئی تھی۔ ہوا یہ کہ شہری انتظامیہ کے زیر اہتمام جو بسیں چلتی ہیں، وہ مرد وعورت دونوں کے لیے ہوا کرتی تھیں اور ان بسوں میں عورتوں کے لیے کوئی علاحدہ کیبن بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ ویسے تو خواتین کے ساتھ دست درازی کے اکا دکا واقعات ساری دنیا میں ہوتے رہتے ہیں، لیکن کچھ عرصے سے اس طرح کے واقعات میں کافی اضافہ ہوگیا۔ شہر کی خواتین نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف پرزور احتجاج کیا اور اس مسئلہ کا مناسب حل نکالنے کی درخواست کی۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ ساؤتھ امریکہ کے اس ملک کی شہری انتظامیہ نے اس طرح کی واردات کی روک تھام کے لیے جو سب سے مناسب حل سمجھا وہ یہ تھا کہ خواتین کے لیے علاحدہ بس چلائی جائے اور اسے عملی طور پر کچھ دنوں کے بعد نافذ بھی کردیا گیا۔ عورتوں کے لیے علاحدہ بس کی فکر کہیں اور نہیں بل کہ امریکہ کے ایک پڑوسی ملک میں پروان چڑھ رہی ہے کہ جہاں ہر لمحہ یہی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان کسی طرح کا کوئی فاصلہ نہیں ہونا چاہیے۔

کل تک بعینہ یہی بات ہم کہتے تھے تو ہمیں ''قدامت پسندی'' کا طعنہ دیا جاتا تھا اور آج اسے ہی اپنے مسائل کا حل سمجھا جارہا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب عورتوں کے لیے علاحدہ بسیں شہر کی مصروف ترین سڑکوں پر دوڑنے لگیں تو ایک صحافی نے کسی خاتون سے سوال کردیا کہ پہلے آپ مرد وعورت کے لیے چلنے والی مخلوط بسوں میں سفر کرتی تھیں اور اب آپ نے اپنے لیے مخصوص بس میں سفر کیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان کس طرح کا واضح فرق آپ نے محسوس کیا ہے؟ ہیوسٹن کرونیکل نامی اخبار کی رپورٹ کے مطابق اس کا جواب یہ تھا میں پہلے کی بہ نسبت اب اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھ رہی ہوں۔ پہلے مجھے ایک سیفٹی پن اپنے ساتھ رکھنا پڑتا تھا تاکہ مردوں کے ذریعہ چھیڑ خانی کے وقت اپنی حفاظت کے لیے اسے استعمال کیا جاسکے، لیکن اب تو اس کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اب میں بڑے اطمینان کے ساتھ بس میں سوار ہوتی ہوں اور کسی ذہنی دباؤ کے بغیر بے فکری کے ساتھ جہاں جگہ ملی کھڑے ہوجاتی ہوں۔

واضح رہے کہ اسلام پہلے ہی سے اس بات کا داعی ہے کہ مرد و زن کا اختلاط ہمارے مفاد میں نہیں، لہٰذا دونوں صنفوں کے درمیان شرم وحیا کا پردہ پڑا رہنا چاہیے اور دونوں کو اپنی اپنی حدوں میں رہ کر زندگی گزارنی چاہیے۔ اسی طرح جسم فروشی کے حوالے سے بھی سخت سے سخت تر قوانین شریعت نے ہمیں دیے تاکہ معاشرہ کو اس کے زہریلے اثرات سے محفوظ رکھا جاسکے۔

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ کل تک جس چیز کی پرزور حمایت میں وہ دلائل دیا کرتے تھے، آج اسی کے خاتمے کی تجاویز منظور کر رہے ہیں۔ فکر ونظر کا یہ واضح تضاد کیوں کر واقع ہوا۔ اگر آپ گہرائی میں اتر کر ان دونوں حالتوں کا عادلانہ تجزیہ کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ نقطۂ نظر کا یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ پہلے انھوں نے صرف تصویر کے ایک رُخ پر توجہ دی جب کہ تصویر کا دوسرا رخ ان کے لیے پوری طرح پوشیدہ رہا۔ انھوں نے پہلے صرف اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزارنے پر توجہ دی، جب کہ اس کے نتائج سے وہ مکمل لاعلم رہے۔ اب جب کہ خواہشات نفسانی کے پیش نگاہ بنائے گئے ضابطے نتائج کے اعتبار سے ضرر رساں ثابت ہو رہے ہیں، تو انھیں ترمیم کی سوجھی۔

صاحبو! یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر فخر سے ہمارا سینہ کشادہ ہو جاتا ہے اور ہم پورے ایمان ویقین کے ساتھ اعلان کر دیتے ہیں کہ "ہماری شریعت" میں اس طرح کے رد وبدل کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیوں کہ یہ اس ذات کی بنائی ہوئی ہے جس کی نظر تصویر کے دونوں رخوں پر ہے۔ وہ ذات اس بات سے بھی واقف ہے کہ بندے کو کہاں تک اور کیسی آزادی دی جانی چاہیے اور کس مرحلے پر اس کے پاؤں میں ضابطے کی زنجیریں ڈال دی جانی چاہییں۔ کسی انسان کے ذریعہ تشکیل شدہ ضابطہ آنے والے مستقبل کے تقاضوں کا ایک اجمالی تخمینہ لگا کر بنایا جاتا ہے، جب کہ الٰہی ضابطہ مستقبل کے تقاضوں کا واقعی علم رکھ کر بنایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں معاملے کی سنگینیت کا علم حالات کے واقع ہو جانے کے بعد ہوتا ہے، جب کہ شریعت اسلامیہ پہلے ہی روک لگا کر ہمیں خطرات سے باخبر کر دیتی ہے۔ اور یہیں سے یہ حقیقت بھی آفتاب نیم روز کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ آخر انھیں بار

بار اپنے قوانین میں ترمیم کی ضرورت کیوں پڑتی ہے اور کیوں ہم اس امر کے داعی ہیں کہ قرآن میں کسی قسم کی ترمیم کی ضرورت نہیں؟ اسی کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ چوں کہ قرآن کریم صبح قیامت تک ہمارے لیے رہ نمائی کا فریضہ انجام دے گا، اس لیے بسا اوقات ہوسکتا ہے کہ بعض جزوی ضابطے کی حکمتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہوں، لیکن یہ ایمان رہے کہ وہی حق ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ آنے والے مستقبل میں موجودہ حالات میں تغیر وتبدل کے بعد اس کی حقیقتیں ہم پر آشکار ہو جائیں اور ہم اپنے ماتھے کی آنکھ سے دیکھ لیں کہ ہمارے لیے اسی میں بہتری تھی؟

میانہ روی بہترین حکمت عملی ہے

اقتصادی محاذ پر کمیونسٹ اور سرمایہ دارانہ نظام کی ناکامی کے بعد دُنیا اسلام کی طرف دیکھ رہی ہے

آج سے تقریباً بیس سال قبل سوویت یونین کے زمیں بوس ہونے کے ساتھ کمیونسٹ نظام کی ناکامی کھل کر ظاہر ہوگئی تھی اور دنیا نے یہ اچھی طرح سے محسوس کرلیا تھا کہ ملک کے تمام شہریوں پر دولت کی یکساں جبری تقسیم کسی طور فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس وقت سرمایہ دارانہ نظام کے حامی یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ تجرباتی طور پر ان کے نظام نے ایک بار پھر دنیا کے سامنے اپنی بادشاہت ثابت کردی ہے۔ کسے معلوم تھا کہ دو دہائی کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کے مصنوعی غبارے سے بھی ہوا آخر نکل ہی جائے گی۔

''وال اسٹریٹ پر قبضہ کرو'' نامی تحریک ماہ ستمبر ۲۰۱۱ء میں امریکہ سے شروع ہوئی اور صرف چند ہفتوں میں دنیا کے مختلف ملکوں تک جا پہنچی۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق برطانیہ، جرمنی، یونان، اسپین، اٹلی، کوریا، ہانگ کانگ، تائیوان، نیوزی لینڈ سمیت دنیا کے تقریباً ۸۲ ممالک کے ۹۵۱ شہر اس کی لپیٹ میں ہیں۔ اس تحریک کے اسباب سے قطع نظر چند ہفتوں میں ہی دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کا پہنچ جانا یہ واضح کرتا ہے کہ عالمی سطح پر بہ ہر حال اقتصادی اعتبار سے لوگوں میں بہت عرصے قبل سے بے چینی رہی ہوگی۔ ورنہ ایسا نہیں ہوتا کہ چند افراد کے ذریعہ بلند کی جانے والی آواز کو اس قدر قلیل مدت میں عالمی سطح پر لوگ اپنی آواز سمجھ لیں۔ اس طرح یہ کہنا بے جا نہیں کہ اقتصادی محاذ پر سرمایہ دارانہ نظام کی ناکامی بہت پہلے سے واضح ہو چکی تھی، یہ اور بات ہے کہ اس کے اظہار کے

لیے مناسب وقت بہت دیر سے ہاتھ لگا۔

دراصل موجودہ اقتصادی نظام کی بنیاد ''واقعی حالات'' سے زیادہ ''مصنوعی خیالات'' پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حقیقت کا چہرہ بے نقاب ہوا، تصویر صاف نظر آنے لگی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ حالیہ اقتصادی نظام کا کنٹرول شیر بازار کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ کسی نے ایک کمپنی کھولی اور اس کے شیئر بازار میں فروخت کرنے کے لیے کھول دیے۔ قطع نظر اس کے کہ واقعی کمپنی منافع میں ہے، اگر طے شدہ پلان کے مطابق چند ذمہ داران اس کے شیئر اونچے نرخوں میں خریدنے لگیں، تو ایسا محسوس کرلیا جاتا ہے کہ کمپنی کا مستقبل روشن و تابناک ہے، لہٰذا اس کے شیئر خرید لیے جائیں۔ اب جب دوسرے لوگ اس کے شیئر خریدنے لگتے ہیں تو ذمہ داران کمپنی اپنے اپنے شیئر بیچ دیتے ہیں۔ اس طرح وہ بڑے پیمانے پر منافع حاصل کر کے کمپنی کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کردیتے ہیں۔ یہ ایک فرضی مثال ضرور ہے، لیکن غور کریں تو محسوس ہوگا کہ اس قسم کی بہت ساری کمپنیاں دنیا میں موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام بھی اقتصادی شراکت کا حمایتی ہے، بل کہ اسے مستحسن بھی سمجھتا ہے۔ ''اللہ کے نبی سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے فرمایا:

''اَنَا ثَالِثُ الشَّرِیْکَیْنِ مَالَمْ یَخُنْ اَحَدُھُمَا صَاحِبَہٗ ، فَاِذَا خَانَہٗ خَرَجْتُ مِنْ بَیْنِھِمْ۔'' (مستدرک للحاکم، ج:۲، ص:۵۹)

یعنی میں دو شراکت داروں کے درمیان تیسرا رہتا ہوں جب تک کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہ کرے، پھر جب وہ خیانت کر بیٹھتا ہے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ کاروباری شراکت کے حوالے سے یہ بشارت ان لوگوں کے لیے ہے جو عدل و انصاف اور حقیقت پسندی کے ساتھ تجارت کریں، نہ کہ ان کے لیے جو مصنوعی اعتبار سے اپنی تجارت کو پرکشش بنانے کی کوشش کریں۔ اس طرح نہ صرف وہ دوسروں کو فریب دے رہے ہوتے ہیں، بل کہ خود اپنے کاروبار کو ہوا کے دوش پر پھیلا رہے ہوتے ہیں، جو

ایک نہ ایک دن زمیں بوس ہو ہی جاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ جس طرح معاشرہ کے ہر ایک فرد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی آمدنی کے اعتبار سے ہی اخراجات کا دامن وسیع کرے، ٹھیک اسی طرح ایک ملک کے حق میں بھی یہی بہتر ہے کہ وہ بھی اپنی آمدنی کے اعتبار سے ہی خرچ کرے، اس لیے کہ جس طرح ایک فرد آمدنی سے زیادہ خرچ کی وجہ سے مالی زبوں حالی کا شکار ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح وہ ملک بھی اقتصادی بدحالی کے دور سے گزرنے لگتا ہے جو اپنی آمدنی کی پرواہ کیے بغیر بے تحاشا خرچ کرنے لگتا ہے۔ اس حوالے سے مثالیں سامنے ہیں۔

یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کے جو ممالک طاقت ور، ترقی یافتہ اور مستحکم سمجھے جاتے ہیں، وہی دنیا میں سب سے زیادہ مقروض بھی ہیں۔ بی بی سی لندن کی خبر کے مطابق دنیا میں امریکہ سب سے زیادہ مقروض ہے، اس کے بعد انگلینڈ کا نمبر ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مغربی ممالک کی اقتصادیات کی بنیاد حقیقت پسندی پر نہیں، بل کہ کاغذ پر ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ آخر چیزوں کی قیمتیں کبھی تو اچانک بڑھ جاتی ہیں، اور کبھی اچانک حیرت انگیز حد تک کم ہو جاتی ہیں۔ عام سمجھ کے مطابق قیمتوں میں اضافہ تو اس وقت ہونا چاہیے جب مانگ بڑھ جائے اور چیزیں کم یاب ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ قیمتوں میں اضافہ کی بنیاد اگر اسی فلسفہ پر رکھی گئی ہوتی تو بڑھی ہوئی قیمت اس وقت تک کم نہ ہوتی جب تک کہ یا تو مانگ میں کمی ہو جائے یا چیزوں کی پیداوار میں اضافہ ہو جائے۔ قیمتوں میں یہ اچانک اتار چڑھاؤ کسی خارجی اسباب کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بل کہ شیر بازار میں بیٹھے ہوئے کاروباری حصص کے خریدنے والے بڑے بڑے تاجر اسے اپنے مفاد کی خاطر کبھی تو انتہائی بڑھا دیتے ہیں اور کبھی گھٹا بھی دیتے ہیں۔ اس طرح حقیقی طور پر کم آمدنی کے باوجود ظاہری شان و شوکت میں اضافہ کی غرض سے بے تحاشا اخراجات کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کی پالیسی وقتی طور سے پرکشش ہو تو ضرور جاتی ہے، لیکن یہ ہر کیف اندر سے پایہ دار نہیں ہوتی۔

مَیں کہہ یہ رہا تھا کہ اسلام نے ہمیں میانہ روی کا طریقہ اپنانے کی تعلیم دی ہے۔

افراط و تفریط کے درمیان کی راہ اپنانے والے کی تحسین کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ

’’وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔‘‘ (سورۂ فرقان، آیت: ۶۷)

یعنی یہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ ہی بے جا اِسراف کرتے ہیں اور نہ ہی تنگی، بل کہ دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ اپنائے رکھتے ہیں۔

قرآن نے معاشرہ کی اکائی کے حوالے سے تعریف و توصیف کرتے ہوئے یہ اشارہ دیا کہ جب معاشرہ کی اکائی کے حق میں میانہ روی بہتر ہے، تو معاشرہ کی اجتماعی حکومت کے حق میں بھی یہی بہتر ہے کہ وہ بھی اپنی چادر میں رہ کر ہی اخراجات کرے۔

صاحبو! موجودہ حالات میں جب کہ دنیا کے دو بڑے اقتصادی نظریات زمیں بوس ہو چکے ہیں، دنیا بڑی بے چینی کے ساتھ اسلامی اقتصادی نظام کی محتاج ہو گئی ہے۔ ایسا اقتصادی نظریہ جس کی بنیاد پوری طرح حقیقت پسندی، عدل و انصاف اور دیانت داری پر ہو۔ بلاشبہہ اس طرح کے مضبوط ڈھانچے پر بنی ہوئی عمارت کسی آسمانی آفات کی زد پر آ کر تو یقیناً گر سکتی ہے، لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ چند افراد اسے اپنے زور بازو کی طاقت سے زمیں بوس کر سکیں۔

راکھ کے ڈھیر پر قصرِ سلطنت کی تعمیر

ظلم وستم، جوروا ستبداد اور قہر وجبر کے سہارے زمامِ حکومت سنبھالنے والے حکم راں زمینی حقائق سے لاعلم رہتے ہیں

تاریخ گواہ ہے کہ ۲۶/ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو ایران کے بادشاہ محمد رضا شاہ پہلوی کی تاج پوشی کی تقریب کے لیے قصر گلستاں کو نہایت ہی شان وشوکت کے ساتھ آراستہ وپیراستہ کیا گیا تھا۔ اطراف وجوانب کے سارے علاقوں میں قیمتی سجاوٹ کی گئی۔ دور ونزدیک سے آئے ہوئے معزز مہمانوں کی پرتکلف ضیافت کی گئی۔ ایک محدود اندازے کے مطابق اس تقریب میں اربوں روپے صرف کیے گئے۔

اسی کے ٹھیک گیارہ سالوں بعد ۱۹۷۹ء میں خمینی کی قیادت میں آنے والے نام نہاد انقلابِ اسلامی کے نتیجے میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت ختم ہوگئی اور وہ اقتدار سے بے دخل کردیے گئے۔ ساری شاہانہ شان وشوکت زمیں بوس ہوگئی۔ بلاشرکت غیرے پورے ملک کے حاکم کہلانے والے اس قدر ذلیل ورسوا ہوئے کہ اپنے وطن واپس جانے کی بھی جرأت نہ کرسکے اور حسرت والم کے سائے میں امریکہ کی سرزمین پر ہی اپنی زندگی کے آخری ایام گزار دیے۔

یہ ایک مثال ہے اور درسِ عبرت بھی۔ کل جب بادشاہ کی تاج پوشی کے موقع پر پورا ملک فرحت وانبساط میں ڈوبا ہوا تھا تو کسی کے حاشیہ ذہن میں بھی نہ رہا ہوگا کہ ٹھیک گیارہ سالوں کے بعد وہ دودھ سے مکھی کی طرح اقتدار سے بے دخل کریے جائیں گے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کا اقتدار زمیں بوس ہوا۔ اسے دوسرے لفظوں میں بجا طور پر کہا

جاسکتا ہے کہ ایسے ظالم وجابر حکم راں زمینی حقائق سے صرف نظر کرتے ہوئے راکھ کے ڈھیر پر اپنے قصر سلطنت کی تعمیر کرتے ہیں۔ وہ اپنی رعایا کی سسکیوں، آہوں اور بے چینیوں کا مداوا کرنے کی بہ جائے اپنے قدموں کی آہنی چاپوں میں اسے دبانے کی ناکام کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

حال کی مثال لے لیں۔ زین العابدین بن علی برسوں تیونس پر قابض رہے اور ظلم وتشدد کے ساتھ اپنے عصر اقتدار کو طول دیتے رہے، لیکن ایک دن وہ بھی آیا کہ رات کی تاریکی میں دم دبائے انھیں ''بے گھر'' ہونا پڑا۔ ایک باغیرت انسان کے لیے کیا یہ کم ہے کہ اسے اپنا آبائی وطن مجبوراً چھوڑنا پڑے؟ لیکن اسے کیا کہیے کہ اس طرح کے لوگ غیرت مند ہوتے ہی کب ہیں کہ انھیں ذلت ورسوائی سے بچنے کی فکر ہو؟ اسی موقع پر میں نے کبھی کہا تھا کہ ظالم وجابر حکم راں کے سارے اصول وضوابط ہوسِ اقتدار کے اردگرد طواف کرتے ہیں۔ اقتدار ہی ان کا دین ہوتا ہے، وہی ان کا رشتہ دار ہوتا ہے اور وہی ان کا مونس وغم خوار بھی۔ کہنے کو تو تیونس کے ایک سبزی فروش پر بے جا ظلم وتشدد نے مزاحمت کی چنگاری بھڑکا دی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لوگ زین العابدین سے بے زار تھے، جو موقع کی تلاش میں تھے ہی کہ ذرائع ابلاغ نے اسے جذباتی اسلوب میں اس طرح پیش کیا کہ سارا ملک انتقام کے جذبے سے سرشار ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہ ظاہر مضبوط وپایہ دار حکومت زمیں بوس ہوگئی۔

ابھی ابھی کی بات ہے کہ لیبیا کے معمر القذافی نے تقریباً چالیس سالوں تک جبر وظلم کے سہارے زمامِ اقتدار پر قبضہ جمائے رکھا۔ وہ شاید دنیا کے پہلے حکم راں ہیں جنھوں نے پردے کے پیچھے سے حکومت کرنے کا نرالا انداز اپنایا۔ وہ یہ کہتے نہ تھکتے تھے کہ لیبیا کا اقتدار ان کے ہاتھوں میں نہیں بل کہ عوام کے ہاتھوں میں ہے۔ اسی فکر نے انھیں گرین بک نامی ایک کتاب لکھنے پر مجبور کیا، جسے سمجھنے والے کمیونسٹ طرز فکر کی عربی کاپی کہا کرتے ہیں۔ گرین بک کا ایک فلسفہ ہے کہ ''اللجان فی کل مکان'' یعنی ہر جگہ کمیٹی ہونی چاہیے۔ اس پر ضابطے کے مطابق انھوں نے ہر معاملے کے لیے ذیلی کمیٹیاں بنا رکھی تھیں۔ زمانہ طالب علمی میں ٹی وی پر ہم نے اس طرح کی کمیٹیوں کے جلوے دیکھے ہیں۔ کسی طرح

کا کوئی انتخاب نہیں ہوتا تھا۔ بس لوگ سال کے بعض حصوں میں اپنے اپنے علاقوں میں بنے ہوئے بڑے بڑے عوامی اجتماعات کے مراکز میں جمع ہوجاتے اور مائک پر آکر اپنے اپنے خیالات پیش کرتے۔ بعض اچھے اچھے مشورے بھی دیتے اور اپنے مطالبات بھی رکھتے۔ لیکن مزے کی بات یہ کہ نہ ان قیمتی خیالات سے استفادہ کرنے والا کوئی موجود ہوتا اور نہ ہی مطالبات کے پورا کرنے کی ہی ذمہ داری کسی پر عائد ہوتی۔ سارا دن وہ مائک پر چیختے چلاتے رہتے اور بس۔ اسے ہی خود ساختہ قائد معمر القذافی کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں حقیقی جمہوریت ہے جو کسی نمائندے کے ذریعہ نہیں چلائی جاتی بل کہ ''الشعب یحکم نفسه بنفسه'' یعنی لوگ خود اپنے آپ پر حکومت کرتے ہیں۔ شاید وہ چیخنے چلانے ہی کو حکومت کرنا سمجھتے رہے ہوں گے، جب کہ ہر ذی ہوش انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ زمام اقتدار بہ ہر کیف انہیں کے ہاتھوں میں تھا۔ سیاسی پارٹیوں کے بارے میں کہتے کہ جس نے پارٹی بنائی اس نے ملک کے ساتھ غداری کی۔ وہ کہتے تو تھے کہ ہر جگہ کمیٹیاں ہونی چاہئیں تاکہ آپسی مشورہ سے فیصلہ ہوسکے، لیکن یہ ضابطہ خود ان کے قصر اقتدار کی مضبوط فصیلوں تک پہنچ کر دم توڑ دیا کرتا تھا۔ وہ ملکی پالیسی خود قلم بند کرتے اور اس حوالے سے ملکی مفاد کے بہ جائے ذاتی مفاد کو ترجیح دی جاتی۔

یہی وجہ ہے کہ چھ سات ماہ قبل جب عالمی برادری نے ان سے کہا کہ وہ اقتدار سے بے دخل ہوجائیں تو وہ بڑی معصومیت سے جواب دیتے ہیں کہ ان کے پاس کرسی اقتدار ہے ہی کہاں کہ جس سے کنارہ کش ہوجائیں۔ اسے آنکھوں میں دھول جھونکنا نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ جب بات ''دست بردار'' ہونے کی ہو تو بولیں کہ ہمارے پاس عہدہ ہی کیا ہے کہ جس سے دست بردار ہوجائیں اور جب بات ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے پالیسی سازی کی ہو تو اس لب ولہجے میں گفت گو ہو کہ جیسے وہ ملک کے نمائندہ نہیں بل کہ ملک کے چپے چپے کے بلا شرکت غیرے تنہا مالک ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس طرح کی دوہری پالیسی ظلم وتشدد کی عمر ضرور بڑھا دیتی ہے، لیکن اس کے خلاف ہونے والی آواز کو ہمیشہ کے لیے ختم نہیں کرسکتی۔ لیبیا کی موجودہ صورت حال اس حقیقت کی تازہ ترین مثال ہے۔ چند ماہ قبل

اٹھنے والے غیض وغضب نے ان کے قصر اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے اور تازہ اطلاعات آنے تک مزاحمت کاران کے آبائی شہر سرت پر پوری طرح قبضہ کرنے والے ہیں۔ اس طرح وہ دن دور نہیں کہ معمر القذافی کے چالیس سالہ دور اقتدار کا سورج پوری طرح ڈوب جائے گا۔

اسی طرح مصر کی سرزمین پر عوامی انقلاب کے نتیجے میں حسنی مبارک کے طویل ترین عہد کا خاتمہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ انھوں نے بھی عوام کے لیے حکومت کرنے کی بجائے عوام پر حکومت کرنے کی پالیسی اپنائی۔ وہ زمینی حقائق سے صرف نظر کرتے ہوئے ظلم واستبداد کے ساتھ عوام کی خواہشات کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن دنیا نے دیکھا کہ کس طرح عوامی غیض وغضب کی آندھی نے قصر حکومت کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے۔

صاحبو! شام اور یمن میں بھی کئی ماہ سے حالات خراب ہورہے ہیں۔ وہاں کے جابر و ظالم حکم راں بھی طاقت وقوت کے بے دریغ استعمال کے ذریعہ عوامی مظاہرے کو کچلنے کی لاحاصل کوششیں کررہے ہیں۔ یمن کے علی عبداللہ صالح تو کئی بار اقتدار چھوڑنے کا وعدہ بھی کرچکے ہیں، لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ ہر بار اپنے وعدے سے پھر جاتے ہیں۔ شام کے صدر بشار الاسد بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فوج کشی کے سہارے اپنی میعاد حکومت قدرے بڑھا رہے ہیں۔ بہ ہر کیف مجھے یقین ہے کہ چاہے جتنی بھی کوششیں کرلی جائیں، ان کے اقتدار کا سورج بھی آخر غروب ہوکر ہی رہے گا۔

مندرجہ بالا زمینی حقائق کی بنیاد پر کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ظلم وستم، جور واستبداد اور قہر و جبر کے سہارے زمام حکومت سنبھالنے والے حکم راں دراصل راکھ کے ڈھیر پر اپنے قصر سلطنت کی تعمیر کرتے ہیں، جو کسی بھی لمحہ زمیں بوس ہوسکتا ہے۔ لہٰذا یہ حقیقت ان تمام بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں کے لیے درس عبرت ہے، جو طاقت کے نشے میں بدمست شرابی کی طرح ظلم وتشدد کررہے ہیں کہ وہ اب بھی اپنے اپنے ملکوں میں عدل وانصاف اور احترام انسانیت کی بنیاد پر اصلاحات کی تحریکیں شروع کردیں۔

انڈونیشیا سے ہمیں بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں!

عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی اعتبار سے بھی یہاں کے مسلمان بہت آگے ہیں

ماضی میں انڈونیشیا بھی مغربی استعماری طاقتوں کے زیر اثر رہا ہے۔ تاریخی حقائق کے مطابق ۱۹۴۵ء-۱۹۴۲ء کے درمیان انڈونیشیا پر ہالینڈ کا تصرف رہا۔ پھر جاپان نے اسے اپنے آہنی شکنجے میں لے لیا، مگر جنگ میں جاپان کی ہزیمت نے جلد ہی اسے چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ اس کے باوجود انڈونیشیا پوری طرح آزاد نہ ہوسکا اور اقوام متحدہ کو تقریباً چار سالوں تک ہالینڈ سے گفت وشنید کرنی پڑی۔ بالآخر ۱۹۴۹ء میں یہ ملک باقاعدہ ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے عالمی نقشے پر ابھرا۔ مثل مشہور ہے کہ تاڑ سے گرا اور ببول میں اٹکا، بعینہٖ یہی سرگذشت موجودہ انڈونیشیا کی ہے۔ ہالینڈ کے جابرانہ قبضہ سے چھٹکارا تو مل گیا، لیکن اس کے بعد تقریباً پچاس سالوں تک یہ پے درپے ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہا۔ پہلی بار ۱۹۹۹ء میں یہاں آزادانہ انتخابات ہوئے ہیں اور اب اسے دنیا کی تیسری بڑی جمہوری ریاست ہونے کا شرف حاصل ہے۔ پہلے نمبر پر ہندوستان ہے، پھر امریکہ اور تیسرے پر انڈونیشیا رکھا جاتا ہے۔ یہ فہرست کثرتِ آبادی کی بنیاد پر ہے۔ دنیا کے تمام ایسے ممالک جہاں جمہوری سیاسی نظام عملی طور پر نافذ العمل ہے، ان میں آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا ہندوستان ہے، پھر امریکہ ہے اور اس کے بعد جس کا نام لیا جاتا ہے وہ انڈونیشیا ہی ہے۔ اور اگر آبادی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے، پہلے نمبر پر چین، پھر ہندوستان، پھر امریکہ اور اس کے بعد انڈونیشیا ہے۔

پھر اگر دنیائے اسلام میں آبادی کے زاویے سے دیکھا جائے تو انڈونیشیا مسلمانوں کا

سب سے بڑا ملک کہلاتا ہے۔ آبادی کے تناسب کے پس منظر میں یہاں مسلم ۸۷.۱۸٪، پروٹسٹنٹ ۶.۹۶٪، کیتھولک ۲.۹۱٪، ہندو ۱.۶۹٪، اور بدھسٹ ۰.۷۲٪ وغیرہ آباد ہیں۔

پیو ریسرچ سنٹر واشنگٹن ڈی سی نے ۹؍اگست ۲۰۱۲ء کو اپنی ویب سائٹ پر ایک سروے رپورٹ پیش کی ہے۔ یہ سروے خصوصی طور پر عالم اسلامی کے ۳۹ ممالک میں کرائے گئے جہاں رُوئے زمین پر پھیلے ہوئے مسلمانوں کی تعداد کا تقریباً ۶۷٪ حصہ آباد ہے۔ اعلامیہ کے مطابق یہ رپورٹ اڑتیس ہزار جواب دہندگان کے انٹرویو پر مبنی ہے جسے ۸۰ مختلف زبانوں میں ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۲ء کے درمیان لیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ چند ممالک کو دانستہ طور پر اس سروے سے باہر رکھا گیا ہے، جن میں سعودی عرب، خلیج کی عرب ریاستیں، انڈیا اور ایران وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اعداد وشمار کے جدول سے پتہ چلتا ہے کہ انڈونیشیا میں مسجد جانے والوں کا تناسب دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں کے تقریباً ۹۸٪ لوگ پابندی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، نیز یہ کہ یہاں کے ۹۳٪ لوگوں کی رائے یہ رہی کہ مذہب ان کی زندگی میں نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔

انڈونیشیا کی یہ وہ مذہبی تصویر ہے جو پیو ریسرچ سنٹر کے متذکرہ سروے سے کسی قدر عیاں ہے۔ اب آیئے ذرا ایک دوسرے زاویے سے اس ملک پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ ویسے تو ہم عالم اسلام کی تعلیمی زبوں حالی پر نوحہ کناں رہتے ہیں، لیکن اس آئینے میں جب ہم انڈونیشیا کی تصویر دیکھتے ہیں تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں اور ہم خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ دل تھام کر سنئے کہ یونیسف کی رپورٹ کے مطابق ۱۵ سے ۲۴ سال کی عمر کے سو فی صد بچے تعلیم سے جڑے ہوئے ہیں اور ان ہی عمروں کی ۹۹ فی صد بچیاں بھی تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ اس انکشاف حقیقت سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ یہاں کے مسلمان دینی اعتبار سے بھی بڑے متصلب ہیں اور دنیاوی پس منظر میں بھی بہت آگے۔ یعنی ان کے داہنے ہاتھ میں اگر دین ہے تو بائیں ہاتھ میں دنیا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی پردہ ذہن پر موجود رہے کہ انڈونیشیا قدرتی وسائل وذرائع کی سہارے کوئی بہت زیادہ مالدار ملک نہیں ہے۔ سی آئی اے کی رپورٹ کے مطابق یہاں کی فی

کس آمدنی ۴۷۰۰ ڈالر ہے اور اس لحاظ سے یہ دنیا میں سینکڑوں ممالک سے پیچھے ہے یعنی دنیا میں فی کس سب سے زیادہ آمدنی والا ملک قطر ہے اور پھر نیچے اترتے جائیں تو ۱۵۶ نمبر پر انڈونیشیا ہے۔ یہاں ۱۲.۵٪ لوگ غربت کی ممکنہ لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ اب ذرا وسائل وامکانیات کو ایک جانب رکھیں اور ترقی ودینداری کو دوسری جانب، پھر ایک سرسری موازنہ کریں۔ یہ بات صدفی صد واضح ہوجاتی ہے کہ دولت وثروت کے لحاظ سے تو وہ بہت سے اسلامی ممالک سے پیچھے ہے، لیکن عملی نتیجے کے پس منظر میں وہ سب سے آگے۔

سچ پوچھیے تو انڈونیشیا عالم اسلام کے بیشتر ممالک کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ اسلامی ممالک جہاں قدرتی وسائل کے سہارے دولت کی ریل پیل ہے، انھیں خواب خرگوش سے بیدار ہونا چاہیے۔ آخر یہ کب تک جمود و تعطل کے نشے میں مست رہیں گے؟ اللہ نے پڑول کی صورت میں زیرزمین دولت وثروت کی بہتات دے رکھی ہے۔ اس پر تماشہ یہ کہ زمین کھود کر خزانے نکالنے کی تگ ودو بھی کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کام بھلے سے مغربی ممالک کے ماہرین بہ حسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ یعنی قدرت الٰہی نے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچادی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہماری غفلت وسست روی کا حال یہ ہے کہ ہم انھیں صحیح مصرف میں استعمال کرنے کی کوشش تک نہیں کرتے۔ یقین نہیں آتا تو سر اٹھا کر دیکھیے کہ دنیائے اسلام کی کون سی یونی ورسٹی عالمی اعتبار سے بہترین یونی ورسٹی کی فہرست میں شامل ہے؟ کیا یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ دولت وثروت کی بنیاد پر خوب صورت سے خوب صورت، پایہ دار سے پایہ دار اور بڑی سے بڑی درس گاہیں قائم کی جاسکتی ہیں؟ اور پھر اسی کثرت دولت کے سہارے ذہین سے ذہین، بہتر سے بہتر اور کام یاب سے کام یاب اساتذہ کی خدمات بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

کہنے دیجیے کہ یہ اگر تسلیم شدہ حقیقت ٹھہری تو پھر اس نتیجے پر پہنچنے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا کہ دنیا کی سب سے زیادہ شہرت یافتہ، کام یاب ترین اور ممتاز یونی ورسٹی اس ملک میں ہونی چاہیے جہاں سب سے زیادہ دولت وثروت کی ریل پیل ہے۔ لیکن ہائے افسوس! جہاں وسائل وذرائع کی بھرمار ہے وہی خطہ زمین تعلیمی میدان میں تہی دامن ہے، جن

علاقوں میں آفتاب پوری تمازت کے ساتھ روشن ہے وہی علاقے جہل وناخواندگی کے ظلمات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لیے ذرائع وامکانیات کے باوجود ہم اگر تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ ہیں تو موجودہ صورت حال کی اس کے سوا اور کیا توجیہ ہوسکتی ہے کہ ارباب اقتدار نے تعلیم وصنعت کے میدان میں ترقی وکام یابی پر کوئی توجہ ہی نہیں دی، ورنہ ہم کسی سے پیچھے نہ رہتے۔ کاش اب بھی صاحبان جبہ ودستار کی آنکھیں کھل جائیں تو جلد ہی ہمیں منزل مل سکتی ہے۔

صاحبو! انڈونیشیا جیسے ملک نے مستحکم وسائل وذرائع نہ ہونے کے باوجود جو ترقی کی ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ یہ شان دار کام یابی ہمیں دعوت عمل دیتی ہے کہ شکوۂ ظلمت شب سے کہیں بہتر ہے کہ اپنے حصے کا کوئی چراغ روشن کردیا جائے۔ اگر نیت صاف ہو تو وسائل کی کم یابی کبھی بھی کام یابی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی، بل کہ سچی بات یہ ہے کہ معرکے اسلحے کی بنیاد پر نہیں سر کیے جاتے، ایک معرکہ اگر تقویٰ وپرہیزگاری، طہارت وپاکیزگی اور شرافت ونجابت کے سہارے سر کیا جاسکتا ہے تو دوسرا معرکہ حوصلہ و اُمنگ، عزمِ مصمم اور جذبہ جنوں خیزی کے سہارے بہ آسانی اپنے نام کیا جاسکتا ہے، اور بلاشبہ اسے ہی ہم سچی کام یابی سے تعبیر کرتے ہیں۔

زیر دیوار ذرا جھانک کے تم دیکھ تو لو!
ناتواں کرتے ہیں دل تھام کے آہیں کیوں کر

عالمی دنیا

عصرِ حاضر میں "سیاسی معذرت" ایک مہذب ڈھونگ

ماضی قریب میں سیاسی عمائدین کے "معذرت نامے"
عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی بہترین مثال ہیں

اسی ہفتے افغانستان کی سرزمین پر ڈیرہ ڈالنے والی ناٹو کی فوج نے پاکستان کی فوجی چوکیوں پر بلا اشتعال فائرنگ کی ہے، جس کے نتیجے میں چوبیس سیکیوریٹی اہل کار شہید اور تیرہ زخمی ہوگئے ہیں۔ اس واقعہ کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اطلاعات کے مطابق یہ چوکیاں پاکستان کی سرزمین سے ناٹو پر ہونے والے کسی متوقعہ حملہ سے بچانے کے لیے قائم کی گئی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ جوان جن کی حفاظت کے لیے کمر بستہ تھے، انہیں ظالموں نے انھیں لقمہ اجل بنا ڈالا۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہم اپنی جان کی بازی لگا کر جن کی حفاظت کررہے ہیں، وہی خود ہماری جان لے رہا ہے۔

اگر یہ حادثہ اپنی نوعیت کا پہلا ہوا ہوتا تو کہا جاسکتا تھا کہ "غلطی ہوگئی ہے"، آئندہ اس طرح کے واقعات دہرائے نہیں جائیں گے، لیکن اسے کیا کہیے کہ گذشتہ دس سالوں میں اس طرح کے بیسیوں واقعات ہوئے ہیں۔ پاک فوج کے ترجمان میجر جنرل اطہر عباس کے اعلامیے کے مطابق صرف گذشتہ تین سالوں میں فوجی افسروں سمیت بہتر اہل کار ہلاک اور ڈھائی سو کے قریب زخمی ہوئے ہیں۔ یہ تعداد تو صرف ان کی ہے، جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے محکمہ فوج سے تھا۔ اگر بے گناہ شہریوں کی ہلاکتوں اور زخمیوں کی فہرست بنائی جائے تو یہ تعداد بلاشبہ کئی ہزار تک جا پہنچے گی۔ واضح رہے کہ میں یہاں صرف ان واقعات کے حوالے سے ہی گفت گو کررہا ہوں جوان کے رکارڈ کے مطابق بھی "غلطی سے ہوگئے" والی

فہرست میں ہیں۔ اس طرح کے واقعات میں عام طور پر کبھی کسی محفل شادی میں بم برسائے گئے ہیں اور عورتوں، بچوں اور ضعیفوں تک کا خیال نہیں کیا گیا، کبھی کسی مذہبی تقریب پر اظہار مسرت کے لیے ہونے والی فائرنگ کو "دہشت گردانہ" رنگ دے کر قتل وخون کا بازار گرم کیا گیا، کبھی ناسمجھی میں فوجی چوکی سے رک جانے کا اشارہ نہ سمجھنے پر سواری گاڑیوں کو گولیوں سے نشانہ بنایا گیا اور کبھی کسی گھر میں ہوائی حملہ کر کے اہل خانہ کو ہمیشہ کے لیے سلادیا گیا۔

وہ تو کہیے کہ پاکستانی فوجی چوکی پر حملہ کرنے کی وجہ سے اس قسم کے ظالمانہ حملوں کی قلعی کھل گئی، ورنہ یہی حملہ اگر کسی آبادی میں ہوا ہوتا تو بڑے فخر سے کہہ دیا جاتا کہ ہم نے دہشت گردی کے ایک بہت بڑے اڈے کو تباہ وبرباد کر کے ساری دنیا پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اور پھر دنیا کے ٹھیکے دار ایک دوسرے سے مبارک بادیوں کا تبادلہ بھی کرتے اور اظہار مسرت کی محفلیں بھی سجاتے۔

اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس طرح کے واقعات کے بعد بغیر کسی تاخیر کے پریس کانفرنس منعقد کی جاتی ہے اور پورے عزم وحوصلے کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم نے اس افسوس ناک حادثہ کی تحقیق کے لیے ایک کمیشن بنادیا ہے۔ بہت جلد ہم اس کے عوامل سے دنیا کو باخبر کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں بے چارے غریب کی جان لینے کے بعد تحقیق کریں گے، یعنی "جان" سے زیادہ "تحقیق" کی اہمیت ہے، اسی لیے تو جان بغیر "تحقیق" کے لے لی گئی۔ ذرا سوچیے تو سہی! ہونا تو یہ چاہیے کہ "رسمی تحقیق" کے مقابلے میں "جان" کی اہمیت زیادہ ہوتی اور کسی کی جان لینے سے پہلے اچھی طرح چھان بین کرلی جاتی تاکہ اس طرح کے واقعات سرے سے وجود ہی میں نہ آتے۔ مگر اب تو جان کی جیسے قیمت ہی کوئی نہیں، ذرا سا شک ہوا نہیں کہ سینے میں ساری گولیاں اتار دو۔

پھر واقعات کی تحقیقات کے بعد جب کبھی گوٹ پھنس گئی تو "معذرت نامہ" بھی پریس کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ بے چارے کم زور ونا تواں لوگ پھولے نہیں سماتے کہ فلاں ملک کے سربراہ نے معافی مانگ لی ہے، یعنی ہم نے اس کا سر جھکا دیا ہے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ سیاسی معذرت نامے مارے جانے والے بے گناہوں کی زندگیوں کا بدلہ نہیں ہوسکتے۔

ایسی اطلاعات آرہی ہیں کہ پاکستان کی بندرگاہ سے ہوکر خشکی کے راستے افغانستان جانے والے وہ ٹرک جو ناٹو کے لیے رسد فراہم کرتے ہیں، انھیں بہ طور احتجاج روک دیا گیا ہے۔عوام مطالبہ کررہی ہے کہ جب تک ذمہ داران اس افسوس ناک واقعہ پر معذرت نہیں کرلیتے، اسے کسی قیمت پر بحال نہیں کیا جاسکتا۔میڈیا کے ذریعہ لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ناٹو کے لیے پاکستان کی بندرگاہ اس وجہ سے بھی نہایت اہم ہے کہ افغانستان کی سرحد کا کوئی حصہ سمندر سے نہیں ملتا، لہٰذا، بحری بیڑوں کے ذریعہ لایا جانے والا وزنی سامان بہ ہر کیف پاکستان کے خشکی راستے ہی سے گزر کر افغانستان پہنچے گا۔اس طرح ناٹو کو بہ ہر حال پاکستان کی کروروں عوام کے مطالبے کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چلیں تسلیم کرلیں کہ ناٹو کے ذمہ داران معافی مانگ لیتے ہیں، لیکن اس سے حاصل کیا ہوگا۔کیا اس طرح کی وارداتیں ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں گی، جب کہ ماضی میں بھی اس قسم کے نہ صرف واقعات ہوئے ہیں، بل کہ ذمہ داروں کے ذریعہ بڑے ہی طمطراق کے ساتھ معذرت نامے بھی پریس کے حوالے کیے گئے ہیں۔

صاحبو! ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی معافی مانگ لے تو فطری طور پر اس کی رگ رگ میں احساسِ ندامت اس حد تک رچ بس جاتا ہے کہ دوبارہ وہ ارتکاب خطا کے حوالے سے ایک نہیں سو بار سوچتا ہے اور پھر عام طور پر اس طرح کی غلطیاں اس سے سرزد نہیں ہوتیں۔لیکن اسے کیا کہیے کہ ساری دنیا میں سیاسی عمائدین کی معذرت بھی "سیاسی ڈھونگ" ہی ہوتی ہے۔وہ بار بار غلطیاں کرتے ہیں اور ہر بار معذرت کرتے ہوئے اپنی پچھلی خطاؤں کو بھول جاتے ہیں۔اسی طرح انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فوج کے ذمہ داران بھی بلا اشتعال فائرنگ کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں کے بعد معذرت تو ضرور کرتے ہیں، لیکن وہ اس طرح کی معذرت سے سبق لینے کی بہ جائے اسے حاشیہ ذہن سے نکال دیتے ہیں۔اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس قسم کی معذرت حقیقت میں بھولی بھالی عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے، اس لیے کہ نہ اس سے کسی قسم کی شرمندگی انھیں ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اس سے کوئی سبق لیتے ہوئے آئندہ کے لیے محتاط ہوتے ہیں۔

برما کے مسلمانوں کا قصور کیا ہے؟

سارے رشتوں سے افضل ترین رشتہ اگر بربنائے اسلام ہوتا ہے اور ہے،
تو پھر ہمیں عملی طور پر بھی اسے ثابت کرنا ہوگا

معلوم تاریخ کے مطابق آٹھویں صدی ہجری میں مسلمانوں کا ایک بحری جہاز دوران سفر "رامری" جزیرے کے قریب تباہ ہوگیا۔کسی طرح چند مسلمان اپنی زندگی بچانے میں کام یاب ہوئے اور جزیرے میں پناہ لینے کے لیے آبادیوں کا رخ کیا۔"اراکن" بادشاہ کو جب ان اجنبیوں کی آمد کی خبر لگی تو اس نے ان کے تعاقب میں اپنے فوجی روانہ کردیے۔کچھ ہی دیر کے بعد فوجیوں نے انھیں اپنے حصار میں لے لیا۔ایسے میں پریشان حال مسلمانوں نے "رحم رحم" کی صدا لگانی شروع کی۔کہتے ہیں یہ عربی لفظ بگڑتے بگڑتے "روہنگیا" ہوگیا اور یہی نام ان کی وجہ شناخت بن گیا۔

روہنگیا مسلمانوں پر ظلم وستم کی تاریخ بڑی ہی الم ناک ہے۔اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق یہ دنیا میں سب سے زیادہ ستائے جانی والی اقلیت میں شمار کی جاتی ہے۔دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان نے برما پر حملہ کردیا جو کہ اس وقت برطانیہ کے زیر تصرف تھا۔مسلم مسلح فوجیوں نے جاپانیوں سے زبردست مزاحمت کی اور برطانیہ اسے واپس لینے میں کام یاب ہوگیا۔جاپانی فوجیوں نے اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے بڑے پیمانے پر روہنگیا مسلمانوں پر ظلم وستم کیا، عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتیاں کی گئیں اور لوگوں کو اپنے گھروں کو چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا۔اپنی جان بچانے کے لیے خیال کیا جاتا ہے کہ تقریباً ۲۲۰۰۰ لوگوں نے بنگال کے علاقے میں پناہ لی جو کہ اس وقت ہندوستان کا حصہ تھا۔۱۹۴۲ء

کی قتل وغارت گری کے دوران تقریباً ایک لاکھ مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔
۱۹۷۸ء میں جب سے برما کے اقتدار پر جنتا حکومت قابض ہے، تب سے روہنگیا مسلمان ہر اعتبار سے ستائے جا رہے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں ''ڈریگن کنگ مہم'' کے دوران ظلم وستم سے تنگ آکر تقریباً ڈھائی لاکھ مسلمان پڑوسی ملک بنگلا دیش ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ ۱۹۸۲ء میں ان کی شہریت چھین لی گئی۔ قانونی طور پر یہ کوئی جائیداد تک نہیں خرید سکتے۔ ان سے معاہدہ کرایا جاتا ہے کہ ان کے یہاں دو سے زیادہ بچے نہ ہوں۔ بغیر اجازت کے انھیں سفر کرنے کی اجازت بھی نہیں۔ ۱۹۹۲ء۔ ۱۹۹۱ء کے درمیان ظلم وستم سے تنگ آکر جان بچانے کے لیے تقریباً ڈھائی لاکھ بنگلا دیش ہجرت کر گئے اور ایک لاکھ کے قریب تھائی لینڈ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ عام طور پر یہ شکایات ہیں کہ برما کی فوج انہیں بڑے بڑے منصوبوں میں بغیر کسی اجرت کے کام کرواتی ہے، نیز خواتین کی آبرو ریزی اور بلاوجہ ظلم وستم تو جیسے روز کے معمولات میں شامل ہوں۔

ہائے افسوس کہ یہ بے بس مسلمان غیروں کے ہاتھوں بھی ستائے جا رہے ہیں اور اپنوں کے ہاتھوں بھی۔ اقوام متحدہ کے ادارے **UNHCR** کی رپورٹ کے مطابق بنگلا دیش میں پناہ لینے والے روہنگیا مسلمانوں کی باز آبادکاری کی کوششیں بار آور ثابت نہ ہوسکی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ بنگلادیش میں پناہ لینے والے روہنگیا مسلمانوں پر بھی غیر انسانی سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس کی ایک بدترین مثال یہ ہے کہ تقریباً ۲۱ دنوں تک سمندر کی لہروں پر رہنے والی کشتی میں سوار بعض مہاجرین کو موت کے منہ سے بہ مشکل بچایا جاسکا ہے۔

دوسری جانب تھائی لینڈ میں پناہ لینے والے مہاجرین کے ساتھ بھی نازیبا سلوک کیا جا رہا ہے۔ ۲۰۰۹ء میں انڈونیشیا کے اہل کاروں نے ایک کشتی کو بچایا جس پر مہاجرین سوار تھے۔ انھوں نے تھائی فوج کے ہاتھوں زدوکوب اور ظلم وزیادتی کی دل دہلا دینے والی روداد سناتے ہوئے بتایا کہ انھیں تھائی فوج نے مار پیٹ کر کشتی میں سوار کیا اور سمندر کے حوالے کر دیا۔ اسی سال پانچ دیگر کشتیوں پر مہاجرین کو سوار کر کے انھیں بھی سمندر میں چھوڑ دیے جانے کی اطلاعات ہیں، جن میں سے چار سمندری طوفان کا لقمۂ اجل بن گئیں اور ایک

ساحل سمندر تک پہنچنے میں کام یاب ہوگئی۔ اس طرح کی شکایات جب عام ہونے لگیں تو تھائی لینڈ کے اس وقت کے وزیر اعظم ابھجیت ویجیویوا نے باضابطہ معذرت بھی کی اور دنیا کو یقین دلایا کہ اس طرح کے افسوس ناک واقعات دوبارہ نہیں ہوں گے۔

ملاحظہ کیجیے! یہ ہے نام نہاد مہذب دنیا کے ایک علاقے کی تصویر کہ جہاں انسانوں کا ایک طبقہ دوسرے کم زور انسانوں پر قہر وغضب کی چنگاری بن کر برس رہا ہے اور لق ودق دنیا کے جغرافیہ پر بیٹھے ہوئے صاحبانِ جبہ ودستار تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ ''نسل کشی'' اسے نہیں کہتے تو اور کسے کہتے ہیں؟ وہ جائداد نہیں خرید سکتے، اپنی مرضی سے کہیں سفر نہیں کرسکتے اور پھر دو سے زیادہ بچے ہونے پر پابندی، نیز دوسری طرف لوگوں کا قتل عام۔

ان ظالمانہ اقدامات پر سرسری نگاہ ڈالتے ہی یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ برما کے ارباب اقتدار ہر چہار جانب سے روہنگیا مسلمانوں کے حلقوم کے گرد زنجیر کس دینا چاہتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ بے رحمی کے ساتھ انھیں قتل کر رہے ہیں اور دوسری طرف اس بات کی اجازت بھی نہیں کہ وہ زیادہ بچے پیدا کریں۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ ایک سرے سے ہم ان کی تعداد کم کریں گے اور دوسرے سرے سے ان کی تعداد میں اضافے پر قدغن لگائے رکھیں گے تاکہ یہ نسل آہستہ آہستہ خود ہی اپنی موت مر جائے۔

صاحبو! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مسلم ممالک کے ارباب اقتدار صرف اپنے حدود میں بسنے والے مسلمانوں ہی کو اپنا کیوں سمجھتے ہیں؟ ذرا دنیا کو یہ بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ انھوں نے یہ ''عظیم ضابطہ'' کن عقلی دلائل وبراہین اور نقلی استدلالات کی روشنی میں تخلیق کیا ہے؟ اچھا پھر یہ بات بھی پیش نگاہ رہے کہ عام طور پر دیکھا یہ جاتا ہے کہ کسی جگہ اگر مسلمان ستائے جا رہے ہوتے ہیں تو دوسرے علاقوں میں رہائش پذیر وہی مسلمان پوری طاقت کے ساتھ احتجاج کرتے جو ان سے کسی نہ کسی حیثیت سے ان کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں، یہ ربط کبھی ہم زبان ہونے کی بنیاد پر ہوتا ہے، کبھی رنگ ونسل کی بنیاد پر، کبھی علاقائی تعلقات کی بنیاد پر، کبھی ہم مذہب ہونے کی بنیاد پر۔

حسن سماعت سے معذرت کے ساتھ وضاحت کردوں کہ میں نے جان بوجھ کر ان

سارے روابط وتعلقات میں سب سے اخیر میں جسے رکھا ہے وہ ہے ''مذہب''، کیوں کہ ہم عملی طور پر سب سے کم اسی ''رشتۂ الفت'' کی قدر کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے حیرت تو ہوگی، لیکن تاریخ کے صفحات میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے حادثات کا ایک سرسری جائزہ لیں تو میری بات صدفی صد درست نظر آئے گی۔ یقین نہ آئے تو فلسطین اور برما کے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم کا موازنہ کرلیجیے، حقیقت آفتاب نیم روز کی طرح آشکار ہوجائے گی۔ یہ تو آپ بہ ہر حال تسلیم کریں گے کہ عرب جس قدر فلسطین کے مسئلہ پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، کیا اسی پیمانے پر برما کے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وتشدد پر نوحہ کناں رہتے ہیں؟ آخر یہ دورنگی کیوں ہے؟ اسی لیے نا کہ یہ ہمارے ہم زبان ہیں اور وہ ہم زبان نہیں۔ یہ حقیقت زبان پر بھلے سے نہ آسکے، لیکن حق یہی ہے، ورنہ اگر مسلمانوں کی حمایت ونصرت کا معیار صرف ''اسلام'' ہوتا تو پھر سلوک بھی ایک ہی جیسا ہوتا۔

واضح رہے کہ میں فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے غیر انسانی سلوک پر احتجاجات کو پس پشت ڈالنے کی بات نہیں کررہا ہوں، بل کہ مدعا صرف اس قدر ہے کہ اگر یہاں اپنے بھائی ستائے جارہے ہیں تو وہاں بھی جو بے رحم جفا فوجیوں کے ہاتھوں ظلم وستم، تعذیب وتشدد اور جور وجفا کا شکار ہیں وہ بھی اپنے ہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں رہائش پذیر مسلمان بھائیوں کے سروں پر قبلہ اول کا سایہ بھی موجود ہے اور وہاں بے چارے ہر اعتبار سے بے سروساماں ہیں، لیکن دونوں ہمارے لیے محترم ہیں۔ بیت القدس کی حرمت وعظمت مسلم، لیکن ایک مسلمان کی عظمت وبزرگی بھی کم نہیں۔ اس لیے سارے رشتوں سے افضل ترین رشتہ اگر بر بنائے اسلام ہوتا ہے اور ہے، تو پھر ہمیں عملی طور پر بھی اسے ثابت کرنا ہوگا۔

خاتون آہن آنگ سان سوچی سیاسی جدوجہد کی علامت

جس طرح ہم غیروں کی جدوجہد کی قدر کرتے ہیں،
کاش غیر بھی عدل وانصاف کے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے ہماری کوششوں کو سراہتے!

برما کی آنگ سان سوچی نے طویل سیاسی جدوجہد کے بعد بالآخر کامیابی کے پہلے زینے پر قدم رکھ ہی لیا۔ ان کی پیدائش جدید برما کے معمار قوم سمجھے جانے والے آنگ سان کے گھر میں ۱۹؍جون ۱۹۴۵ء کو ہوئی۔ برما کی آزادی سے چند ماہ قبل والد کا انتقال اس وقت ہوا جب آپ دو سال کی تھیں۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ماں نے تربیت کی اور عالمی سطح پر شہرت یافتہ آکسفورڈ یونی ورسٹی سے سیاسی علوم، فلسفہ اور معاشیات میں مہارت حاصل کی۔ یہیں ان کی ملاقات مائیکل ایرس سے ہوئی جو بعد میں شادی کے رشتے میں بدل گئی۔ کچھ عرصے بھوٹان اور جاپان میں رہنے کے بعد آنگ سان سوچی نے برطانیہ میں مستقل رہائش اختیار کرلی۔ ۱۹۸۸ء میں اپنی بیمار والدہ کو دیکھنے رنگون آئیں تو ملک کے ابتر سیاسی حالات نے انھیں اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ لوگ فوجی حکومت کی سرپرستی میں ہونے والے مظالم سے تنگ آچکے تھے اور ہر چہار جانب سے صدائے احتجاج بلند ہو رہی تھی۔ یہی تکلیف دہ صورت حال آنگ سان سوچی کی زندگی میں انقلابی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اپنے اہل وطن کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے انھوں نے پورے ملک میں دورہ کیا اور لوگوں سے ظلم وستم، جبر وقہر اور زیادتی کے خلاف پرامن تحریک میں شامل ہونے کی اپیلیں کیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے غم وغصہ ملک کے کونے کونے تک پہنچ گیا اور ذمہ داروں کو دو سالوں کے بعد ہی انتخاب کرانا پڑا۔ بتایا جاتا ہے کہ آنگ سان سوچی کی پارٹی نے انتخاب

میں ۸۱٪ سیٹیں حاصل کرلیں جو کہ پارلیامنٹ کی کل ۴۸۵ نشستوں میں سے ۳۹۲ بنتی ہیں۔ جمہوری ضابطوں کے مطابق آنگ سان سوچی کی نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی پارٹی کے حوالے اقتدار ہونا چاہیے تھا، لیکن ملک پر قابض فوج نے انتخاب میں واضح اکثریت سے کام یاب ہونے والی پارٹی کو اقتدار سونپنے کی بہ جائے آنگ سان سا چی کو نظر بند کردیا۔ اس طرح کم و بیش ۲۱ر سالوں تک انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ اپنے وطن کے لیے ان کی قربانیوں کی قیمت اس حیثیت سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس درمیان جب ان کے شوہر انگلینڈ میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے تو فوجی حکومت نے انھیں انگلینڈ چلے جانے کی پیش کش کی مگر انھوں نے اسے خوب صورتی کے ساتھ ٹھکرادیا، کیوں کہ وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھیں کہ ایک بار برما سے باہر چلے جانے کے بعد ان کے لیے دوبارہ ملک میں داخل ہونا مشکل ہوجائے گا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ فوجی حکومت نے ان پر جس طرح کے نفسیاتی حربے استعمال کیے انھیں برداشت کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ اپنے بچوں کے دیکھنے کی خواہش کسے نہیں ہوتی، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ فوجی حکومت نے انھیں بیٹے سے ملنے پر بھی پابندی عائد کردی تھی۔ تقریباً دس سالوں کے بعد انھوں نے اپنے بیٹے کیم ایرس سے ملاقات کی۔ بہ ہر حال ابھی ہونے والے حالیہ ضمنی الیکشن میں آن سانگ سوچی بھاری اکثریت سے کام یاب ہوچکی ہیں۔ اس طرح انھوں نے ملک میں حقیقی جمہوریت کی طرف عملی قدم اٹھالیا ہے۔

اجمالی طور ان کی قربانیوں کی ایک سرسری جھلک آپ نے دیکھ لی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے وطن کے لیے ان کی قربانیاں آب زر سے لکھنے لائق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا کی ہم دردیاں ان سے وابستہ تھیں اور حکومتی سطح پر بھی ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی۔ یورپین پارلیامنٹ نے انھیں ۱۹۹۰ء میں **Shakharov Prize** سے نوازا۔ ۱۹۹۱ء میں انھیں امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں جواہر لال نہرو ایوارڈ برائے عالمی افہام و تفہیم آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ انھیں وینزویلا حکومت کی طرف سے **Simmon Bolivor Prize** دیا گیا۔ ۲۰۰۷ء میں حکومت کناڈا نے انھیں اعزازی شہریت دی جو

کہ اب تک صرف پانچ افراد کو دی گئی ہے۔ ۲۰۱۱ء میں مشیگن یونی ورسٹی کی جانب سے انھیں **Wellenberg Medal** سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بھی یقیناً چھوٹے بڑے دوسرے انعامات ضرور ہوں گے جن سے انھیں عزت بخشی گئی۔

اب آیئے اسی پس منظر میں ہم عالم اسلام کا جائزہ بھی لے لیں۔ بلاشبہ آن سانگ سوچی کو جمہوری ضابطوں کے مطابق انتخاب جیت جانے کے بعد بھی اقتدار نہ سونپا جانا صریح زیادتی ہے اور کسی مظلوم سے اخلاقی ہم دردی کا مظاہرہ کرنا بھی زمانے کا دستور ہے، لہٰذا ہمیں ان کے ساتھ کی جانے والی ہم دردی سے کوئی شکوہ نہیں، لیکن ذرا یہ بھی تو دیکھیے کہ یہی ”فلسفہ ہم دردی و معاونت“ دنیا میں سب کے لیے کیوں نہیں روا رکھا جاتا؟ کہیے تو یاد دلا دوں کہ ۱۹۸۹ء میں جب الجزائر کے قانون میں تبدیلی کی گئی اور سیاسی پارٹی بنانے کی اجازت ملی تو عباس مدنی نے ”اسلامی نجات دہندہ“ نامی پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ صرف چند مہینوں میں اس پارٹی کا حلقہ اثر حیرت انگیز حد تک وسیع ہوگیا۔ یہی وجہ تھی کہ ملک کے ہونے والے انتخابات کے پہلے مرحلے میں ہی اس پارٹی نے اتنی بڑی کام یابی حاصل کرلی کہ دوسرے مرحلے میں ہونے والے انتخاب کی حیثیت نام کی رہ گئی تھی۔ اطلاعات کے مطابق اس پارٹی نے ۱۸۸ر نشستوں پر کام یابی حاصل کرلی تھی جب کہ دیگر پارٹیوں نے محض ۴۱ سیٹیں جیتی تھیں۔ کسی اسلامی پارٹی کی یہ محیر العقول کام یابی غیروں کی نظروں میں کھٹکنے لگی۔ فرانس کے اشارے پر صدر شاذلی بن جدید کو اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا اور ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے فوجی ڈکٹیٹر نے آتے ہی دوسرے مرحلے کا انتخاب منسوخ کردیا۔ اور پھر جب اسلامی نجات دہندہ پارٹی کے حمایتیوں نے پرامن احتجاج کیا تو انھیں پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ پارٹی کی قیادت کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔ ملاحظہ فرمایئے کہ عباس مدنی اور آن سانگ سوچی دونوں کے حالات میں کس قدر یکسانیت ہے، لیکن ہونے والے عالمی رد عمل میں کس قدر بعد، ایک پر انعام و اکرام کی بارش اور دوسرے کے لیے تہمت فتنہ و فساد کی سوغات۔ حد درجہ افسوس تو یہ ہے کہ غیر تو غیر ہیں، اپنوں نے بھی اس صریح ظلم و ستم، زیادتی و ناانصافی اور حق تلفی کا شکوہ تک نہیں کیا۔ اسی

طرح فلسطین میں ۲۰۰۶ء کے درمیان ہونے والے انتخاب میں "حماس" نے بڑے پیمانے پر کام یابی حاصل کرلی اور "فتح پارٹی" کو زیر کردیا۔ چوں کہ "حماس" کو عام طور پر مذہبی پارٹی کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے، اس لیے اسے شدید بیرونی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوری ضابطوں کے مطابق پارلیامنٹ میں اکثریت حاصل کرنے کے باوجود انھیں اقتدار ہاتھ نہیں آیا۔ ۲۰۰۷ء میں افہام و تفہیم کے ذریعہ ایک متحدہ حکومت تشکیل دی گئی اور فلسطین میں غزہ کے علاقے پر ہی انھیں اقتدار دیا گیا۔

صاحبو! ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ ایک ہی طرح کے افتادوں پر دنیا کے دو قسم کے سلوک ہیں۔ یعنی صرف یہ نہیں دیکھا جاتا کہ معاملہ کیا ہے، بل کہ اس پر بھی نظر رکھی جاتی ہے کہ زد میں آنے والا کون ہے؟ آیا وہ اپنا ہے یا پرایا، اپنا ہے تو اس سے اظہار ہم دردی بھی کی جائے گی، اس کے آنسو بھی پوچھے جائیں گے، انھیں سر پر بھی بٹھایا جائے گا، ان کی مالی معاونت بھی کی جائے گی، اور اگر وہ پرایا ہے تو منہ پھیر لیا جائے گا، دامن بچا کر نکلنے کی کوشش کی جائے گی، تہمتیں لگا کر حوصلہ شکنی کی جائے گی...... اور موقع ہاتھ لگا تو کچل کر بھی رکھ دیا جائے گا۔ غور کیجیے کہ کیا واقعی ہم "ترقی یافتہ عہد" میں زندگی گزار رہے ہیں یا وہی پرانی ریت ہے کہ "معاملہ خواہ کچھ بھی ہو اپنا ہر حال میں اپنا ہے اور غیر ہر حال میں غیر"۔

مذہبی منافرت دُنیا کو تباہ و برباد کر دے گی

امریکہ میں مذہبی عبادت گاہوں پر ہونے والے پے در پے حملے سیاسی عمائدین کے لیے درسِ عبرت ہیں

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مذہبی عبادت گاہوں پر ہونے والے پے در پے حملوں نے دنیا کو سکتے میں ڈال دیا ہے۔ پہلا حملہ وسکونسین کے ایک گوردوارہ میں اس وقت ظہور پذیر ہوا جب سکھ بڑی تعداد میں اپنی عبادتوں میں مصروف تھے۔ دوسرا حملہ مسوری کے زویلین اسلامک سنٹر پر ہوا جس میں مسجد پوری طرح جل کر خاک ہوگئی اور دو دن قبل تیسرا حملہ الینوائے کے شہر مورٹن گرو کی مسجد پر ہوا۔ ان تینوں حملوں میں جو چیز قدرِ مشترک ہے وہ ہے "کسی عبادت گاہ پر مذہبی منافرت کے جذبات کا اظہار"۔ بہت ممکن ہے کہ محکمہ تفتیش کے اہل کاروں کے ذریعہ ان حادثات کے پس پردہ مزید کچھ اور سنسنی خیز انکشافات سامنے آئیں، لیکن بہ ہر حال مذہبی منافرت پر مبنی شدت پسندی کو کسی طور ممکنہ عوامل کی فہرست سے خارج کرنا دشوار ہوگا۔ میری باتوں میں دم نہ محسوس ہو تو تینوں حادثات پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لیجیے، حقیقت خود بخود سامنے آجائے گی۔

وسکونسین صوبے کے مشہور شہر ملواکی کے اوک کریک علاقے میں واقع گرودوارہ میں ۵/اگست ۲۰۱۲ء کو ایک شخص نے لوگوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔ یہ گرودوارہ ۱۹۹۷ء میں تعمیر کیا گیا تھا جس میں تقریباً تین سے چار سو افراد کی گنجائش تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک چالیس سالہ سفید فام امریکی دو بندوقیں اٹھائے اس وقت گرودوارہ میں داخل ہوا جب لوگ اپنے عقیدے کے مطابق عبادتوں میں مصروف تھے۔ آتے ہی اس نے لوگوں پر اندھا دھند

فائرنگ شروع کردی، جس کے نتیجے میں سات لوگ مارے گئے اور ۲۵ کے قریب زخمی ہوئے۔ اسی درمیان کسی نے پولیس کو فون کیا۔ پولیس کی بروقت مداخلت کی وجہ سے حملہ آور موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ اس واقعے میں پولیس کی محتاط دخل اندازی کے باوجود ایک پولیس کا جوان زخمی ہوا، جواب خطرے سے باہر بتایا جاتا ہے۔

۶/اگست ۲۰۱۲ء میں میسوری صوبے کے شہر جاپلن کی ایک مسجد کو نذرِ آتش کردیا گیا، جس سے وہ پوری طرح زمیں بوس ہوگئی۔ اطلاعات کے مطابق یہ آگ رات کے کسی حصے میں لگائی گئی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ مسجد کے سیکوریٹی کیمرے میں محفوظ تصاویر کے سہارے مجرم کا کوئی سراغ لگایا جاتا، لیکن شدت تپش سے یہ کیمرے بھی پوری طرح تباہ و برباد ہوگئے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس افسوس ناک حادثے سے ٹھیک ایک ماہ قبل ۴/جولائی ۲۰۱۲ء کو بھی ایک شخص نے مسجد کی چھت پر کوئی جلتی ہوئی چیز پھینکی تھی۔ مسجد کی انتظامیہ کے مطابق مسجد کے سیکیوریٹی کیمرے کے ریکارڈ میں یہ آسانی کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص رات کی تاریکی میں جلتی ہوئی چیز مسجد کی چھت پر پھینک رہا ہے اور تیزی کے ساتھ بھاگ جاتا ہے۔ ۴/جولائی کے اس واقعہ سے مسجد کی عمارت کو کوئی بڑا نقصان نہ پہنچا تھا۔

صوبہ الینوائے کے شہر مورٹن گروی کی ایک مسجد کو ۱۰/اگست ۲۰۱۲ء بہ روز جمعہ بندوق سے نشانہ بنایا گیا۔ مسجد سے متصل رہائشی علاقے کا ڈیوڈ کونریڈ اس افسوس ناک حادثہ میں ملوث بتایا جاتا ہے۔ یہ شخص شروع سے ہی مسجد کی تعمیر کی مخالفت کرتا رہا ہے۔ ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۴ء کے درمیان مسجد کی تعمیر رکوانے کے لیے اس نے عرضی داخل کی تھی۔ مسجد کے صدر جناب علیم الدین کی وضاحت کے مطابق بندوق کی گولی سے مرکز کا محافظ بال بال بچا ہے اور عمارت کو جزوی نقصان پہنچا ہے۔ چوں کہ یہ مہینہ رمضان المبارک کا ہے، اس لیے مسجد میں عام دنوں کی بہ نسبت زیادہ تعداد میں لوگ عبادت کے لیے آتے ہیں، اس لیے اس طرح کے واقعات سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے اور لوگ بڑے ہی محتاط ہوگئے ہیں۔ محکمہ پولیس کے مطابق ممکنہ مجرم کے خلاف اقدام قتل کا مقدمہ درج کرلیا گیا ہے اور معمول کی ضروری کارروائی شروع کردی گئی ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ ملزم ہمیشہ سے مسجد میں آنے جانے والے لوگوں کی گاڑیوں کی پارکنگ کے مسئلے پر شکوہ کرتا رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ لوگ دیر رات گئے اپنی کاروں کی لائٹیں جلاتے ہیں جس سے اس کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ مسجد کے صدر کہتے ہیں کہ ہم نے اس کی شکایات کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے نمازیوں سے درخواست کی تھی کہ وہ پارکنگ کے حصے میں اپنی گاڑیوں کی لائٹیں بلاوجہ روشن نہ رکھیں اور پارکنگ کے لیے مخصوص حصے میں ہی اپنی کاریں پارک کریں۔

آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ یہ تینوں حادثات اس لیے ظہور پذیر نہیں ہوئے کہ کسی کو کسی سے کوئی ذاتی رنجش اور مخاصمت تھی، بل کہ ان کے پس پردہ جو جذبہ کارفرما ہے وہ ہے "مذہبی منافرت"۔ اگر یہ بات عین حقیقت نہیں تو بتایا جائے کہ گرودوارہ میں اپنے عقائد کے مطابق عبادتوں میں مصروف سکھوں کا قصور کیا ہے؟ جاپلن اسلامک سنٹر کی عمارت نے کس کی حق تلفی کی ہے؟ مورٹن گروو کی مسجد کو کس جرم کی پاداش میں گولیوں سے نشانہ بنایا جارہا ہے؟ اسی طرح آپ ہر اس مذہبی عبادت گاہ کے حوالے سے سوالات کرتے چلے جائیں جسے نشانہ بنایا گیا ہو، جواب صرف ایک ہی ہوگا کہ لوگوں میں ایک دوسرے کے حوالے سے مذہبی رواداری ختم ہورہی ہے۔ اب اگر ذرا ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس امر کا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے کہ آخر لوگوں میں مذہبی منافرت کیوں فروغ پارہی ہے، تو سینکڑوں جوابات کے درمیان سب کے نزدیک تسلیم شدہ جواب یہ ضرور ہوگا کہ اسلام دشمن عناصر کے ذریعہ میڈیا میں "نفرت انگیز مواد" کی اشاعت۔ دوسرے لفظوں میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں میں ہونے والے افسوس ناک حادثات کے پیچھے عمومی طور پر مسلمانوں ہی کی جانب انگشت نمائی کی رٹ۔ ظاہر ہے کہ جب سوچی سمجھی سازش کے تحت ایک ہی بات بار بار لوگوں کو سنائی جائے گی تو اذہان وقلوب میں غم وغصہ کے جذبات کی پرورش فطری طور پر ہوتی ہی رہے گی۔ پھر اسی غم وغصہ کے ملے جلے اثرات کے نتیجے میں "مذہبی منافرت" پر مبنی حادثات ظہور پذیر ہو جائیں تو حیرت کیسی؟ لہٰذا یہ بات کان کھول کر سن لی جائے کہ اگر دنیا کو دہشت گردی سے آزاد کرنا ہے تو پھر مسلمانوں کے خلاف زہر

اگلنے کا سلسلہ بند کرنا ہوگا اور ہر واقعہ کے پس پشت پہلی ہی نظر میں کسی مسلمان کی طرف انگشت نمائی سے گریز کرنا ہوگا۔ اسی کے ساتھ امن پسند شہریوں کو بھی اپنے طور پر مذہبی رواداری کو فروغ دینا ہوگا۔ اس حوالے سے وسکونسین کے یہود و نصاریٰ کے اقدامات قابل تحسین ہیں۔ مسجد کے امام کی اطلاع کے مطابق جوں ہی مسجد کے نذر آتش کیے جانے کی خبر علاقے میں پھیلی آس پاس کے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہود و نصاریٰ بھی اظہار افسوس کے لیے جمع ہو گئے۔ امام مسجد سے ملاقات میں یہود و نصاریٰ نے اس واقعہ کی مذمت کی اور اعلان کیا کہ ہم سب اپنے سرمایہ سے اسے دوبارہ تعمیر کریں گے جو کہ سابقہ عمارت سے کہیں زیادہ عالی شان، دیدہ زیب اور مستحکم ہوگی۔ یہ اعلان اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ اس سے بلاشبہ مذہبی شدت پسند گروہ کی حوصلہ شکنی ہوگی اور کیا عجب کہ انھیں اپنے ہی خیمے کے لوگوں کے ذریعہ اس قسم کے خوش گوار اقدامات سے اصلاح کا کوئی موقع میسر آجائے۔

صاحبو! مذہبی منافرت ہی وہ عنصر ہے جس کی کارفرمائیوں کے نتیجے میں روئے زمین کا چپہ چپہ کشت وخون سے لالہ زار دکھائی دیتا ہے۔ یہ جذبہ جس قدر فزوں ہوتا جائے گا، اسی قدر دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ بھی ہوتا جائے گا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ”مذہبی منافرت“ کی ترویج واشاعت عصر حاضر کی سب سے بڑی دہشت گردی ہے۔

دہشت گردی کی طرح لوگوں کی دل آزاری بھی دنیا کے لیے خطرناک

دہشت گردی کے واقعات سے تو چند لوگ متاثر ہوتے ہیں،
لیکن مذہبی دل آزاری سارے ماننے والوں کو غم زدہ کر دیتی ہے

۲۸ر اپریل ۲۰۱۲ء کی تاریخ مہذب دنیا کے ماتھے پر سیاہ داغ کی حیثیت سے انصاف پسندوں کو ہمیشہ شرمندہ کرتی رہے گی کہ اسی دن ٹیری جونز نامی ایک نام نہاد پادری نے سکھوں کے سامنے اپنے چرچ میں قرآن پاک کا ایک نسخہ نذر آتش کر دیا۔ یہ واقعہ اس قدر افسوس ناک ہے کہ جس کی نہ صرف مسلمانوں نے مذمت کی ہے، بل کہ غیروں حتی کہ خود ٹیری جونز کے ہم مذہبوں نے بھی اپنے غم وغصہ کا سخت لفظوں میں اظہار کیا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی واقعہ کے ناحق ہونے پر سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اپنوں کے ساتھ ساتھ غیروں کے لیے بھی وہ ناپسند ہو جائے۔

اس افسوس ناک واقعہ کے حوالے سے گفت گو کرنے سے قبل بہتر ہے کہ ٹیری جونز کے ماضی کے اوراق کسی قدر ہماری نگاہوں کے سامنے رہیں۔ ٹیری جونز ۱ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں امریکہ کے صوبے میزوری میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی اور اس کے بعد **Southeast Missouri State University** میں دو سال کالج کے گزارے۔ ۱۹۷۰ء میں ہوٹل کا منیجر بنایا گیا۔

اسی دوران **Campus Ministries Marantha** میں معاون پادری کا عہدہ حاصل کرنے میں کام یاب ہو گیا۔ عام طور پر چرچ کی ذمہ داری مذہبی تعلیم کے حصول کے بعد ہی دی جاتی ہے، لیکن اس نے عیارانہ چال چلتے ہوئے ۱۹۸۳ء میں کیلی فورنیا کے

ایک غیر تسلیم شدہ کالج سے اعزازی ڈگری حاصل کرلی۔

دنیاوی زندگی میں ناکامی کے بعد جرمنی چلا گیا اور وہاں اسی چرچ کی شاخ کی حیثیت سے **Christliche Gemeinde (CGK)** نام کے ایک چرچ کی بنیاد رکھی۔ بتایا جاتا ہے کہ ٹیری جونز عیسائی مذہب کے مطابق لوگوں کی مذہبی راہ نمائی کرنے سے زیادہ اپنے بے ہنگم خیالات کی ترویج واشاعت پر زور دیتا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ **German Evangelical Alliance** کے مطابق اسے چرچ سے مستعفی ہونا پڑا۔ اسی دوران جرمن کے مقامی کورٹ نے فرضی بنیاد پر ڈاکٹر لکھنے کی پاداش میں اس پر ۳۸۰۰ ڈالر کا جرمانہ بھی عائد کردیا۔ اسی کے ساتھ ۲۰۰۸ء میں اس پر فراڈ کے سنگین الزامات لگ گئے اور چرچ بند ہوگیا۔ حالات دن بدن ٹیری جونز کے لیے نامناسب ہوتے گئے اور بالآخر اس نے مستقل طور پر امریکہ واپسی کا ارادہ کرلیا۔ فلوریڈا میں واقع **Dove World Outreach Center** نامی چرچ سے پہلے ہی سے جزوقتی وابستگی رہی تھی، لہٰذا یہاں کا پادری بن گیا۔

یہ شخص پہلی بار اس وقت میڈیا کی سرخیوں میں آیا جب اس نے ۲۰۱۰ء میں بڑے پیمانے پر قرآن پاک کے نسخے جلانے کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت امریکی انتظامیہ نے بیرون ملک اسلامی ممالک میں تعینات امریکی فوجیوں پر ہونے والے ممکنہ ردعمل کی دہائی دیتے ہوئے اسے راضی کرلیا تھا کہ وہ اپنے اشتعال انگیز منصوبے سے باز رہے۔ اس وقت ساری دنیا کے انصاف پسندوں نے ٹیری جونز کی معاندہ حرکتوں کی سخت مذمت کی اور اسے اسلام کے خلاف منافرت پھیلانے کی سازش قرار دی۔ اس طرح ساری دنیا کے انصاف پسند شہریوں نے ٹیری جونز کی کھل کر مخالفت کی۔

مجھے یاد ہے کہ اسی مناسبت سے امریکہ کے فاکس نیوز چینل نے ۲۱/اپریل ۲۰۱۱ء کو چند سرکردہ افراد کے ساتھ ٹیری جونز سے مباحثہ کا پروگرام نشر کیا تھا، جس میں ٹیری جونز کے ساتھ ساتھ شیعہ عالم امام حسن قزوینی، **Central United Methodist Church** کے پادری **Rev.ED Rowe** اور ایک مذہبی امور کے ماہر وکیل نے

شرکت کی تھی۔ دورانِ مباحثہ شیعہ عالم نے اسلام کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے حوالے سے تحسین آمیز پیرایہ بیان میں گفت گو کی گئی ہے، لہٰذا قرآن کی توہین سے لازم آئے گا کہ وہ ان کی بھی توہین کررہے ہیں جنھیں خود ان کا مذہب عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دوسرے پادری نے بھی ٹیری جونز کی کھل کر مذمت کی اور کہا کہ قرآن نذرِ آتش کرنے کا اعلان خود ان کے مذہبی تعلیمات کے خلاف ہے۔ وہ کہنے لگے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو درگزر کرنے، معاف کرنے اور لوگوں کے ساتھ بھلائی کا حکم دیا ہے، پھر قرآن کے جلادینے سے تو لوگوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوں گے جو کہ عیسائیت کے رہ نما اصولوں کے بھی خلاف ہے۔ لہٰذا ٹیری جونز کا یہ عمل عیسائیت کی توہین ہے، مارٹن لوتھر کنگ کی تعلیمات کی توہین ہے اور دنیا کے ایک بڑے مذہب کی توہین ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے اشتعال انگیز اعلان کی وجہ سے پاکستان اور افغانستان میں جو لوگ مارے گئے ہیں ان کے قتل میں ٹیری جونز بھی برابر کے شریک ہیں۔

پروگرام کے میزبان نے بھی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ شاید اس وقت ساری دنیا کے ناپسندیدہ شخص ٹیری جونز ہی ہے۔ اور اس کے بعد پھر امریکہ کے مختلف حصوں سے سامعین کے مختصر مذمتی بیانات کا تانتا بندھ گیا۔ میری آنکھیں بھر آئیں کہ لو ہم تو ہم ہیں تمہارے بھی تمہارے ساتھ نہیں کہ اللہ تمہارے ہم مذہبوں سے ہی تمھیں بے عزت کرارہا ہے۔ سچ ہے کہ عزت بھی اسی ذات برتر و بزرگ کے ہاتھ میں ہے اور ذلت و رسوائی سے دوچار کرنا بھی اسی کی مشیت پر منحصر ہے۔

کہتے ہیں کہ جو بے عزت شخص ہوتا ہے اسے ہر قدم پر بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ اور بات کہ اس کے نزدیک پیمانۂ عزت و خواری ہی بدل جائے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ تاریخ انسانی میں ایسا ہی ایک نام ٹیری جونز کا ہے جو بار بار ذلیل و خوار ہو رہا ہے مگر احساسِ ندامت ہی نہیں۔

اب دیکھیے کہ اس نے اسلام کے خلاف ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا **"Islam is of the Devil"** اس کی ترویج کے خیال سے اس نے اپنے چرچ کے ممبروں میں ایک

ٹی شرٹ تقسیم کی جس پر جلی حرفوں میں یہی عبارت چھپی ہوئی تھی۔ جب یہ شرٹ بچے پہن کر اسکول گئے تو استاذ نے یہ کہہ کر انھیں واپس گھر بھیج دیا کہ اس طرح کے لباس اسکول کے طے شدہ ضابطوں کے خلاف ہے۔ ابھی حال ہی میں انگلینڈ میں کسی ریلی میں شرکت کرنے کی اسے دعوت دی گئی تھی، لیکن Hope not Hate نامی تنظیم نے بڑی مستعدی سے ٹیری جونز کی برطانیہ آمد کے خلاف تحریک چھیڑ دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا نام بھی برطانیہ کی حدود میں نہ داخل ہونے والوں میں درج کر لیا گیا۔ اس طرح جب تک اس کا نام بلیک لسٹ میں رہے گا اس وقت تک وہ برطانیہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

صاحبو! ویسے تو یورپ و امریکہ میں چرچ اقتصادی اعتبار سے بڑے ہی مال دار ہوتے ہیں، لیکن ٹیری جونز کا چرچ مالی اعتبار سے بہت کم زور ہے۔ یہ حقیقت خود ثبوت دے رہی ہے کہ علاقے میں اس کی مقبولیت کا گراف کس قدر نیچے ہے، لیکن جناب نے اعلان کر رکھا ہے کہ وہ آنے والے صدارتی انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ بار بار کی بے عزتی سے ابھی جی بھرا نہیں ہے، یا پھر یہ کہ جب حیاتِ مستعار کے صفحات میں چند بے عزتیاں لکھی ہی ہوئی ہیں تو دو چار دس اور سہی! شاید اس بدبخت نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جس طرح خواہ ایک انسان کی جان لیں یا دس کی سزا بہر حال موت ہونی ہے، لہٰذا جب ایک بار سامان عزت سر بازار نیلام ہو ہی چکا ہے تو پھر دو چار بار مزید ہو جائے تو کیا مضائقہ؟ بجا فرمایا آپ نے، اگر عزت و عظمت، قدر و منزلت اور فخر و افتخار جیسے صفاتِ حسنہ کے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی تو پہلے اعلان کے ردعمل پر ہونے والی رُسوائی ہی کافی نہ ہو گئی ہوتی؟ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی ذلیل و رُسوا انسان کو یوں ہی بے لگام چھوڑ دیا جائے، بل کہ حکومت کے ذمہ داروں کو چاہیے کہ وہ اس قسم کے خبطی لوگوں سے سختی کے ساتھ نپٹے کیوں کہ ان کی حرکتیں دہشت گردی کے واقعات سے کہیں زیادہ دنیا کے لیے خطرناک ہیں۔ دہشت گردانہ واقعات سے تو چند ہی لوگ متاثر ہوتے ہیں، جب کہ ٹیری جونز کی اشتعال انگیزی سے دنیا کے ۱.۶ اربلین مسلمانوں کے دینی جذبات مجروح ہوئے ہیں۔

دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کام یاب نہیں

فوجی کارروائیوں کے نتائج کے استقرا کے بعد
مغربی تحقیقی ایجنسی کی حتمی رپورٹ نے قلعی کھول دی

امریکہ میں ہونے والے گیارہ ستمبر کے حملے کے بعد تیسری دنیا کے مسلم ممالک کے خلاف یک طرفہ کارروائیوں کا سلسلہ چل پڑا۔ سب سے پہلے افغانستان کو نشانہ بنانے کی تیاری ہوئی۔ اسامہ بن لادن کی حوالگی کا مطالبہ طول پکڑتا گیا اور پھر اچانک رونگٹے کھڑے کر دینے والا فضائی حملہ شروع ہو گیا۔ کئی ہفتے لگاتار بم برسانے کے بعد افغانستان کے مشہور شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کی جانیں گئیں اور بے شمار زندگی بھر کے لیے معذور ہو گئے۔ اس کے بعد عراق کی باری آئی۔ دنیا کو عراق پر حملے کے لیے اپنا ہم خیال بنانے کے پیش نظر بے بنیاد الزامات گھڑے گئے۔ جن میں سرفہرست یہ الزام تھا کہ عراق کے پاس بڑی تعداد میں وسیع پیمانے پر تباہ و برباد کرنے والے ہتھیار ہیں جو کہ امن پسند دنیا کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ صدام حکومت نے بار بار صفائی دی کہ ان کے پاس اس قسم کے ہتھیار نہیں ہیں، لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی اور عراق کے شہروں پر بم برسائے جانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند ہفتوں میں عراق کو تہس نہس کر دیا گیا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد تفتیشی ایجنسیوں نے عراق کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن اسلحے کا وہ ذخیرہ برآمد نہ ہو سکا جس کو بہانہ بنا کر عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ دنیا کو حیرت ہوئی کہ انسانیت کی تباہی کا وہ ذخیرہ کہاں چھپ گیا جسے ہزاروں میل دور سے بیٹھے بیٹھے صدر جارج بش نے دیکھ لیا؟

عراق پر حملے کا خودساختہ بہانہ کس قدر ظالمانہ تھا کہ اپنے تو اپنے غیر بھی چیخ پڑے اور پوری شدت کے ساتھ دنیا کے انصاف پسندوں نے مذمت کی۔ مثال کے طور پر ابھی حال ہی میں برطانوی اخبار ''دی آبزرور'' میں جنوبی افریقہ کے مشہور آرچ بشپ ڈیز منڈ ٹوٹو کا کالم شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سابق وزیراعظم برطانیہ ٹونی بلیر اور سابق صدر امریکہ جارج بش پر جرائم کی عالمی عدالت میں مقدمہ دائر کرنا چاہیے کیوں کہ انھوں نے عراق میں وسیع پیمانے پر تباہی کے ہتھیار ہونے کے بارے میں دنیا سے جھوٹ بولا۔ ڈیز منڈ ٹوٹو کے مطابق تاریخ میں کسی اور جنگ نے دنیا کو اتنا غیر مستحکم نہیں کیا جتنا عراق جنگ نے کیا ہے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ان حالات میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغربی رہ نماؤں کے لیے مختلف معیار ہوتا ہے۔

بہ ہر کیف میں کہہ یہ رہا تھا کہ افغانستان اور عراق کی جنگ بہ نام دہشت گردی لڑی گئی تھی۔ اس پس منظر میں جب ہم **RAND** کی رپورٹ دیکھتے ہیں تو حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ

> ***"In only 7 percent of cases was military action effective in terminating the activities of terrorist groups."***

> ''صرف سات فی صد ایسے کیس ہیں جہاں فوجی کارروائی دہشت گردی کو کچلنے میں مؤثر رہی ہے۔''

آپ محسوس کر رہے ہیں کہ مغربی دنیا جن تنظیموں کو ''دہشت گردی'' کی فہرست میں شامل کر چکی ہے، بات انہیں کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ ایسی ہی تنظیموں کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں صرف سات فی صد کام یابی حاصل کی جا سکی ہے۔ واضح رہے کہ زیر بحث گفت گو میں غیر جانب دارانہ تحقیقات کے نتیجے میں قرار دی جانے والی دہشت گرد تنظیموں کے حوالے سے گفت گو نہیں ہو رہی ہے، بل کہ مغربی طاقتوں نے اپنے خیال میں جنھیں دہشت گرد قرار دیا ہے انہیں پر استقرا کے نتیجے میں اس حقیقت کا

انکشاف کیا جا رہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ خود وہ اپنے خود ساختہ اقدامات کے آئینے میں ناکام نظر آ رہے ہیں، پھر بھی اسی ناکام اقدام کا حلقہ مزید وسیع کرنے پر اصرار بھی ہے۔ دوسری جانب دہشت گردی کے خاتمے کے لیے جو طریقہ زیادہ کارگر ثابت ہوا ہے، اسے بیان کرتے ہوئے رپورٹ انکشاف کرتی ہے:

> ***"The largest group, 43 percent of terrorist groups, ended through transition into the political process, in other words, through compromise."***

> ''سب سے بڑی تعداد یعنی ۴۳ فی صد دہشت گرد تنظیموں کو سیاسی دھارے میں شامل کر کے ختم کیا جا سکا ہے، دوسرے لفظوں میں انھیں گفت و شنید کے ذریعہ رام کرنے میں کام یابی حاصل ہوئی ہے۔''

یہی بات عرصہ دراز سے دنیا کا ہوش مند طبقہ کہہ رہا ہے، لیکن کوئی ہے ہی نہیں جو کان دھرے۔ ماتم یہ ہے کہ جن کے پاس اختیارات ہیں انھیں غور و فکر کرنے کی فرصت نہیں اور جو اِمعانِ نظر کے ذریعہ حالات کا تجزیہ کر کے متوازن اقدامات کو حتمی شکل دینے کی قدرت رکھتے ہیں ان کے پاس اختیارات ہی نہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ اصحاب اقتدار دنیا کے حقائق کا سامنا کریں اور سوچ سمجھ کر فیصلے کریں۔ یہ بات تو ہر خاص و عام سمجھ سکتا ہے کہ کسی بھی شدت پسند تحریک کو کچلنے کے لیے جب فوجی کارروائی کی جاتی ہے تو اس سے صرف وہی لوگ متاثر نہیں ہوتے جو متذکرہ تحریک کے حامی ہیں، بل کہ اکثر و بیشتر وہ طبقہ بھی زد میں آ جاتا ہے جسے اس قسم کی تحریکوں سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ لیکن جب انھیں ناکردہ گناہ کی سزا دی جاتی ہے تو خواہ مخواہ ان کے دلوں میں شدت پسندوں سے ہم دردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح فوجی کارروائی کے اثر سے اگر تحریک کا ایک دو ممبر ختم ہوتا ہے تو دوسرے لوگ اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فوجی کارروائی کے نتیجے میں خاطر خواہ کام یابی نہیں ملتی۔ چوں کہ یہ تحقیق کسی خاص طبقے کو پیش نگاہ رکھ کر نہیں کی گئی ہے بل کہ دنیا

میں برسرِ پیکار مسلح جدوجہد کرنے والی تمام تنظیموں کو ہدف بنایا گیا ہے، اس لیے حکومتوں کی چشم پوشی کے نتیجے میں ہونے والے عوامی غیض وغضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بھی مفید طریقہ کار کی وضاحت کی گئی ہے۔

"When a terrorist group becomes involved in an insurgency, it does not end easly. Nearly 50 percent of the time, groups ended by negotiating a settlement with the government...."

''جب کوئی دہشت گرد تنظیم بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو اسے ختم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ تقریباً پچاس فی صد حالات میں ایسی تنظیموں کو حکومت کے ساتھ قابلِ قبول معاہدہ کے ذریعہ ہی ختم کیا جا سکا ہے۔''

صاحبو! آپ یقیناً میری بات سے اتفاق کریں گے کہ مندرجہ بالا استقرائی انکشاف میں دنیا کے لیے ایک نہایت ہی اہم درس ہے اور وہ یہ ہے کہ کس طرح مسلح جدوجہد کرنے والی تنظیموں کو قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ بے روزگاری، عدم خواندگی اور عدل و انصاف کے واقعی تقاضے پورے نہ کیے جانے کی وجہ سے دنیا کے کونے کونے ایسی جماعتیں موجود ہیں جو حکومتوں سے نبرد آزما ہیں۔ ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ نکسلی تحریک اس کی بہترین مثال ہے۔ جس کی جارحانہ کارروائیوں سے ہندوستان کا ایک بڑا حصہ متاثر ہے۔ ماضی میں کئی بڑی فوجی کارروائیاں اسے ختم کرنے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ حکومتِ ہند کے ذمہ داران گفت وشنید کے دروازے کھول دیں اور بلا استثنا ہر اس تنظیم سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں جو اپنے مطالبے میں شدت پیدا کرنے کے لیے تشدد کی راہ اپنائے ہوئے ہے۔ بہت ممکن ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی کے اس اقدام کو بھی حزبِ اختلاف کی جماعتیں موضوعِ ملامت بنا لیں، لیکن ملک کے بڑے مفاد میں اس طرح کی جارحانہ تنقیدوں کی کوئی وقعت نہیں۔

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

موجودہ رُوس اور سابق سوویت یونین اب تک ایک سو چودہ بار، امریکہ بیاسی، برطانیہ بتیس، فرانس اٹھارہ اور چین سات مرتبہ اپنے ویٹو کا حق استعمال کر چکا ہے

سوویت یونین کے زمیں بوس ہونے کے بعد سے دنیا کا سیاسی توازن کسی حد تک ایک طرفہ ہو گیا ہے۔ امریکہ اور سوویت یونین جیسی دو بڑی طاقتوں کے درمیان سرد جنگ کے زمانے میں کسی ملک کے خلاف بڑے فیصلے کرنا کسی قدرے دشوار تھا۔ وہ یوں کہ اگر کسی ملک کو دوسرے سے خطرے کا اندیشہ ہو جاتا تو وہ دونوں بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک کے دامن میں پناہ لے لیتا۔ اب اگر فریق مخالف اقوامِ متحدہ کے ذریعہ بھی کسی عملی اقدام کی کوشش کرے، جب بھی اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملتی تھی کیوں کہ اسے ''ویٹو'' کر کے پاس ہی نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس طرح واقعی عدل وانصاف کا دور دورہ تھا، بل کہ مدعا صرف اس قدر ہے کہ پہلے دو بڑی طاقتوں کے اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے نتیجے میں ''ظلم وستم''، ''ناانصافی وحق تلفی'' اور ''زیادتی وسختی'' پر مشتمل واقعات کی تعداد میں کسی حد تک کمی ہوتی رہی ہے، لیکن جب سے سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا ہے، تب سے ایک طبقہ بلا روک ٹوک سڑکوں پر دندناتے پھر رہا ہے۔ یقین نہ آئے تو ماضی کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لے لیں، میرا تجزیہ سو فی صد درست نظر آئے گا۔

کہتے ہیں کہ دنیا ایک ہی طرز پر زیادہ دنوں تک نہیں چلتی۔ حالات کے مطابق فکر ونظر کے زاویوں میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی منظرنامے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کسی ملک کے لیے خاموشی ہی کبھی اس کے مفاد میں تھی،

لیکن حالات کے تقاضے بدلے اور اب صدائے احتجاج بلند کرنا ہی اس کے مفاد میں ہو گیا۔
اس کینوس پر ملک شام کے حوالے سے روس کی خارجہ پالیسی نہایت ہی فٹ بیٹھتی ہے۔
جب تک روس سوویت یونین کا حصہ رہا، اپنے مخالفین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا رہا، لیکن جب سوویت یونین کے مصنوعی قلعے کی دیواریں پاش پاش ہو گئیں تو پھر خوف زدہ بلی کی طرح دب کر بیٹھ گیا۔ ''ویٹو کا حق'' حاصل ہونے کے باوجود اس نے گذشتہ دس سالوں سے مکمل خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ اس درمیان کبھی تو اس نے دوسروں کی ہاں میں ہاں ملانے کی پالیسی اپنائی اور کبھی اقوام متحدہ کے ذریعہ پاس ہونے والی قرارداد پر ووٹنگ کے وقت غیر حاضر رہ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، جب کہ پچھلی تاریخ بتاتی ہے کہ سوویت یونین نے سلامتی کونسل میں دوسرے دائمی ممبروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ویٹو کا حق استعمال کیا ہے۔ موجودہ روس اور سابق سوویت یونین اب تک ایک سو چوبیس، امریکہ بیاسی، برطانیہ بتیس، فرانس اٹھارہ اور چین سات مرتبہ اپنے ویٹو کا حق استعمال کر چکا ہے۔

ملک شام سے روس کے مفادات کچھ اس طرح منسلک ہیں کہ وہ کسی قیمت پر بھی ایسی کوئی قرارداد پاس نہیں ہونے دینا چاہتا کہ جس سے شام پر اس کے اثر و رسوخ متاثر ہوں۔ بتایا جاتا ہے کہ موجودہ صدر بشار الاسد کے والد حافظ الاسد نے ۱۹۷۱ء میں سابق سوویت یونین کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا، جس کے مطابق سابق سوویت یونین نے شام کے ساحلی شہر طرطوس میں اپنے بحریہ کی نگہداشت اور کمک کی فراہمی کے لیے ایک اڈا قائم کیا تھا۔ اسی معاہدہ کی وجہ سے روس نے شام پر واجب الادا اپنے قرض کا دو تہائی حصہ معاف کر دیا تھا۔ اس وقت سے روس اور شام کے درمیان بڑے ہی گہرے مراسم رہے ہیں۔ ۲۰۰۸ء میں جب یورپ کے ساتھ روس کے تعلقات میں قدرے تلخی پیدا ہوئی اور امریکہ نے پولینڈ میں میزائل دفاعی سسٹم نصب کیا تو بشار الاسد نے روس کو طرطوس میں مستقل فوجی بیس بنانے کی اجازت بھی دے دی۔ اس کے علاوہ شام نے روس سے اسلحہ کی خریداری کا بھی بڑا معاہدہ کر رکھا ہے۔ خود روس کے وزیر خارجہ سرجی لاورو نے اقوام متحدہ کے دورے میں میڈیا سے گفت گو کرتے ہوئے کہا تھا کہ روس نے شام سے ۴ بلین ڈالر سے زیادہ مالیت کے اسلحہ کی

فراہمی کے لیے معاہدہ کر رکھا ہے۔ اس میں فضائی دفاعی سسٹم، لڑاکا طیارہ، میزائل اور بحری جہاز تک شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ روس کی تجارتی کمپنیاں بھی شام کے مختلف منصوبے پر کام کر رہی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ حمص کے قریب قدرتی گیس کے لائق استعمال بنانے کا کارخانہ روس کی تعمیراتی کمپنی ہی تیار کر رہی ہے اور عراقی سرحد کے قریب تیل کے ذخائر تلاش کر کے تیل نکالنے تک کے سارے ٹھیکے بھی روس کی کمپنیوں کے ہاتھوں میں ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کی بنیاد پر یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ کئی سالوں تک فعال عالمی سیاست سے دور رہنے والے روس نے شام کے معاملے میں دنیا کو اپنے وجود کا احساس دلانے کی کوشش کیوں کی ہے؟ ٹھیک ہے ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ روس بھی ایک بڑی طاقت ہے اور اسے یہ بتانے کا حق ہے کہ اس کے منہ میں بھی زبان ہے، لیکن شام میں ہونے والے قتل و خون، ظلم و زیادتی اور جبر و تشدد کے خاتمے کی بھی کوئی سنجیدہ کوشش بہ ہر حال ہونی چاہیے۔ اپنے مفادات کے تحفظ میں ہر چہار جانب سے آنکھیں بند کر لینے سے مصنوعی تاریکی تو پیدا کی جا سکتی ہے، لیکن حقیقی نہیں۔

اب ذرا صبر و ضبط کے ساتھ روس کے وزیر خارجہ سرجی لورو کا وہ بیان بھی پڑھیے جسے انھوں نے آسٹریلیا کے دورے پر پریس کو دیا تھا، موصوف کہتے ہیں کہ

> ***"We are not a friend, we are not an ally of President Assad," Lavrov said in an interview with Australian Broadcasting Corp. television today in Sydney. "We never said President Assad remaining in power is the solution to the crisis. What we did say is it is up to the Syrians themselves to decide how to run the country."***

> ''نہ ہی ہم بشار الاسد کے دوست ہیں، نہ ان کے ساتھی ہیں اور نہ ہی ہم نے کبھی کہا ہے کہ بشار الاسد کا برسر اقتدار رہنا ہی شام کے مسائل کا حقیقی حل ہے، بل کہ ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ شام کے شہریوں ہی کو یہ طے کرنا ہے

کہ وہ کس طرح اپنے ملک کو چلانا چاہتے ہیں۔"

صاحبو! اسے کہتے ہیں ایک منجھے ہوئے سیاسی لیڈر کے منہ سے نکلے ہوئے جملوں کے پس پردہ فکری قلابازیاں .... ایک ایسا بیان جو نہ دوسرا سمجھ سکے اور نہ ہی وہ خود۔ انصاف کا دامن تھامے ہوئے ہو سکے تو اسے دوبارہ پڑھ لیجیے، حقیقت چیخ چیخ کر کذب بیانی کی گواہی دے گی۔ اصرار ہے تو تھوڑی دیر کے لیے مان لیتے ہیں کہ روس شام کا دوست بھی نہیں اور بشار الاسد کا حمایتی بھی نہیں، لیکن یہ تو بتائیے کہ پھر اقوام متحدہ میں "ویٹو پاور" کے استعمال کے ذریعہ بڑے بڑوں کو ناراض کرنے کی زحمت کیوں گوارا کی جا رہی ہے؟ اگر انسانی بنیادوں پر شام کی عوام سے ہم دردی ہے تو پھر سیاسی اثر ورسوخ کی بنیاد پر طرفین کو گفت گو کی میز پر کیوں نہیں بٹھایا جا رہا ہے؟ موصوف کہتے ہیں کہ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ شام کی عوام اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرے۔ ذرا ان سے کوئی پوچھے کہ تیونس، لیبیا اور مصر میں ہونے والے عوامی احتجاجات کے نتیجے میں شام کی عوام بھی اپنے ملک میں سیاسی اصلاحات کے لیے جب سڑکوں پر نکلی تو کس قسم کے اسلحے ان کے ہاتھوں میں تھے؟ جب کہ حقیقت کے آئینے میں حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات دوپہر کی دھوپ کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ شام کے بعض شہروں میں لوگوں نے سیاسی اصلاحات کے لیے پر امن احتجاج کیا تو اسے طاقت سے دبانے کی کوشش کی گئی اور ٹینکوں کے منہ مظاہرین کی طرف کر دیے گئے۔ کیا یہ شام کی عوام کے ذریعہ ہی ملک کو چلانے کی خواہشات کا اظہار نہیں تھا؟

اقوامِ متحدہ میں ملتِ اسلامیہ کے لیے مستقل نشست ضروری

سوا دو سو کروڑ مسیحیوں کی نمائندگی تین ممالک کر رہے ہیں
جب کہ دو سو کروڑ مسلمانوں کے لیے ایک نمائندہ بھی نہیں

اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ گذشتہ چند دہائیوں سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی حرکتیں مسلسل کی جا رہی ہیں۔ کبھی سلمان رشدی مفروضہ فکر کی بنیاد پر بے ہنگم ناول کے ذریعہ سرور کائنات ﷺ کی پاک دامن زندگی کو داغ دار کرنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی ڈنمارک کا متعصب صحافی مضحکہ خیز کارٹون بنا کر اپنے ذہنی دیوالیہ پن کا اظہار کرتا ہے، کبھی افغانستان کی سرزمین پر قرآن پاک کے اوراق کی بے حرمتی کی جاتی ہے، کبھی ٹیری جونس جیسے پادری قرآن کریم کو سب کے سامنے نذر آتش کرتے ہیں اور کبھی نیکولا باسلی جیسے شر پسند عناصر پردہ سیمیں پر سرکار دو عالم ﷺ کی عائلی زندگی کی مخرب اخلاق تصویر دنیا کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ یہ تو صرف مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والے افسوس ناک واقعات کی فہرست ہے، جب کہ مسلمانوں کی عزت وآبرو، غیرت وحمیت اور جان ومال کی تباہی وبربادی کی داستان اس پر مستزاد ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، نگاہ اٹھائیں اور عراق کے کھنڈرات دیکھ لیں۔ یہ ٹوٹے ہوئے گریہ کناں کھنڈرات ظلم وستم، جور واستبداد اور ہلاکت وبربادی کی داستان غم سنانے کے لیے کافی ہیں۔ افغانستان کی سرزمین کے طول وعرض کا جائزہ لیں۔ کس قدر ہنستی کھیلتی آبادی تباہ وبرباد کر دی گئی۔ مسلمان امن وامان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے اور تہی دامانی کے باوجود دین کی بالادستی کے لیے سرگرم عمل بھی تھے کہ اتنے میں جنگی جہازوں کے ہول ناک حملوں

نے سکون چھین لیا، توپوں کے دہانے بم برسانے لگے اور لہلہاتا ہوا چمن دیکھتے ہی دیکھتے مرجھا گیا۔ نہ جانے کتنی عفت مآب خواتین کا سہاگ اجڑ گیا، بے شمار بچے ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گئے، ان گنت بے گناہ زندگی بھر کے لیے اپاہج ہو گئے اور کتنے ہی گھر سسکتی ہوئی چیخوں کے ملبے تلے دب گئے۔

کیا مسلمانوں کے خلاف عالمی سطح پر ہونے والے پے در پے افسوس ناک واقعات ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟ اب بھی ہم اگر "ہم چو من دیگرے نیست" کی لوری سن کر خوش فہمی کے نشے میں مست رہنے کے عادی ہیں تو سنیے اور شعور و آگہی کے کان سے سنیے، دل کی آنکھ سے دیکھیے اور عقل و فراست کی زبان سے بولیے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایک محتاط سروے کے مطابق اس وقت پوری دنیا میں تقریباً ۲۰۳ کروڑ مسیحی اور تقریباً ۲۰۰ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مسیحی مفادات کی نگرانی کے لیے اقوامِ متحدہ کی سیکوریٹی کاؤنسل میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس تین تین ممالک کی نہ صرف مستقل نشست ہے، بل کہ انھیں ویٹو پاور کا حق بھی حاصل ہے۔ یعنی جب بھی اقوام متحدہ کے کسی فیصلے سے ان کے اپنے مفادات پر ضرب لگے تو یہ بلا تاخیر اپنے ویٹو پاور کے استعمال کے ذریعہ اسے منسوخ کر سکتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اقوام متحدہ کے ۱۹۳ ر ممبر ممالک کسی فیصلے پر متفق ہو جائیں لیکن سیکوریٹی کاؤنسل میں مستقل رکنیت رکھنے والا ایک ملک مخالفت کر دے تو وہ "عالمی اجتماعی متفقہ فیصلہ" ہو کر بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے گا۔ اس پس منظر میں یہ بھی واضح رہے کہ اگر روس اور چین کو کمیونسٹ فکر کے حامل ممالک میں شامل کر دیا جائے تو لا مذہبیت کے نشے میں مست رہنے والے افراد دنیا کی معلوم آبادی کا ۱۵ ر فی صد، جب کہ مسیحی ۳۳ فی صد اور مسلمان ۲۹ فی صد بنتے ہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ سیکوریٹی کاؤنسل میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے ساتھ ساتھ جن دو دیگر ممالک کو بھی مستقل رکنیت اور ویٹو پاور کا حق حاصل ہے ان میں روس اور چین بھی شامل ہیں۔ اب ذرا غور کیجیے کہ جو صرف دنیا کی آبادی کا ۱۵ ر فی صد ہیں ان کی نمائندگی کے لیے دو ممبران، اور جو ۳۳ فی صد ہیں ان کے لیے تین، لیکن جو

دنیا کی آبادی کا ۲۹ فی صدی ہیں ان کی کوئی مستقل نمائندگی سیکوریٹی کاؤنسل میں نہیں ہے۔

اس حقیقت پر ایک دوسرے پس منظر سے بھی غور کرتے ہیں تو افسوس ناک نتیجہ ہی سامنے آتا ہے۔ دنیا کے ان ممالک کی تعداد جہاں ۵۰ فی صدی سے زیادہ لوگ مسیحی مذہب پر یقین رکھتے ہیں تقریباً ۱۲۷ ر ہے، جب کہ تنظیم عالم اسلامی کے ممبروں کی تعداد ۵۷ ہے۔ اس طرح اگر ۱۲۷ ر پر تین ممالک کی نمائندگی ہے تو اسی تناسب سے مسلمانوں کی بھی دو یا کم از کم ایک کی نمائندگی تو بہر حال ہونی ہی چاہیے۔

بہت ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہ کہہ دیں کہ عالم اسلامی کی کوئی نمائندگی مستقل ممبر کی حیثیت سے مجلس امن میں نہ سہی لیکن مجلس عام میں تو سبھی شریک ہیں۔ اس پس منظر میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔ اقوامِ متحدہ کی "مجلس عام" صرف دکھانے کے دانت ہیں، کھانے کے دانت تو "مجلس امن" کے جبڑے تلے پیوستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس عام کے اجلاس میں عالم اسلام کے سربراہان بڑے کر و فر کے ساتھ شرکت کرتے ہیں اور "کمال جرأت و بہادری" کے ساتھ اپنے مسائل پر گفت گو بھی کرتے ہیں، لیکن عملی میدان میں نتیجہ صفر رہتا ہے۔ ایسے موقع پر ہمارے احساسِ فکر کی معصومیت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور ہم فخر سے سینے پھلائے کہتے نہیں تھکتے کہ آج فلاں صدرِ مملکت نے بڑی زبردست بات کہی ہے۔

ہائے رے ملت اسلامیہ کی بے بسی! اسے معلوم ہی نہیں کہ مجلس عام کی نشست صرف زبانی کلامی ہی تک محدود رہتی ہے۔ اگر مجلس عام کی قراردادوں کی واقعی کوئی معنوی حیثیت ہوتی تو مسلمانوں کے کئی ایک سلگتے ہوئے مسائل کب کے حل ہو چکے ہوتے۔

میں مجلس امن میں کسی اسلامی ملک کی مستقل رکنیت پر اس لیے زور دے رہا ہوں تاکہ عالمی سطح پر ہماری ایک مضبوط آواز ہو۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ آپ اگر مذہب اسلام کو ایک بڑے خاندان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو پھر تنظیم عالم اسلامی ایک خاندانی تنظیم ہوئی نہ کہ عالمی تنظیم، اسی طرح عرب لیگ بھی ایک گھریلو تنظیم کہی جانے کی زیادہ مستحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ او آئی سی یا عرب لیگ کے اجلاس میں پاس ہونے والی

قراردادوں سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا؟ ماضی میں کوئی قرارداد ایسی ہے جس نے بڑے ملی مسائل کے حل میں فعال و متحرک کردار ادا کیا ہو؟ اس طرح بلاشبہ اقوام متحدہ ایک عالمی تنظیم ہے اور ایک ممبر ہونے کی حیثیت سے ہر ملک کو اپنے مسائل کے حل کے لیے مشورہ دینے کا حق حاصل ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مجلس امن میں مستقل رکنیت کی حیثیت سے عالم اسلامی کی نمائندگی کرنے کا سب سے زیادہ مستحق انڈونیشیا ہے۔ یہی مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک بھی ہے کہ عالم اسلام کی کل آبادی کا تقریباً ۱۳رفی صدی حصہ اسی سرزمین سے وابستہ ہے۔ مذہبی اعتبار سے ہونے والے ایک سروے سے بھی یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہاں کے لوگ دینی معاملے میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سنجیدہ ہیں۔ ویسے تو ترکی بھی کسی حد تک قدرے بہتر نمائندہ ہے، لیکن یورپی یونین میں شمولیت کے عوض وہ مستقبل میں کبھی بھی مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کا سودا کر سکتا ہے۔ عرب ممالک کی اکثریت کو تو میں پوری طرح ''آزاد'' سمجھتا ہی نہیں ہوں کہ یہ ہنوز مقبوضہ ہیں، فرق صرف اس قدر ہے کہ ماضی میں غیروں کا تصرف بہ راہِ راست ہوتا تھا اور اب بالواسطہ یہی کام اپنے بٹھائے ہوئے پٹھوؤں سے لیا جاتا ہے۔

صاحبو! یقین جانیے اگر ہم واقعی دنیا میں اپنے وقار و تمکنت اور عزت و وجاہت کی بحالی چاہتے ہیں تو ہمیں ہر حال میں اپنے لیے مجلس امن میں ایک مستقل نمائندگی کے مطالبے کی تحریک شروع کرنی ہوگی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس تحریک کو جس قدر ہم پر امن رکھیں گے اسی قدر یہ پایہ داری کے ساتھ آگے بڑھے گی۔ اس تحریک کی قیادت کے لیے اگر عالم اسلام کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے مسلم طلبہ و طالبات میدان میں اتر پڑیں تو یقین کامل ہے کہ بہت جلد ہمیں منزل مل سکتی ہے۔ تحریک کو سنجیدہ رکھنے کے لیے شرکا پر خاموشی کے ساتھ اپنے مطالبات کتبوں میں لکھ کر چلنے کی شرط لگائی جا سکتی ہے۔ جب شرکا تحریک زبان کھولیں گے ہی نہیں اور نہ ہی جذباتی نعرے لگائیں گے تو پھر نہ خون میں ابال آئے گا، نہ ہی توڑ پھوڑ تک بات پہنچے گی اور نہ ہی

غیروں کو سختی کے ساتھ اسے کچلنے کا موقع میسر آئے گا۔ ہمارے نوجوان یہ گمان نہ کریں کہ اتنی بڑی تحریک کے لیے ان کی آواز کیا معنی رکھتی ہے؟ انسانی تاریخ کے صفحات پر ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی جب ظلم و زیادتی کے خلاف اٹھنے والی ایک نحیف و کم زور آواز نے ایک کام یاب تحریک کی شکل اختیار کر لی اور سرکشوں کے آہنی قلعے کفن بر دوش سرفروشوں کے حوصلوں کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔ ماضی قریب کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ جب تیونس میں ایک عام سے سبزی فروش کا احتجاج دیکھتے ہی دیکھتے ایک ملی تحریک میں تبدیل ہو گیا اور برسوں کی پایہ دار حکومت کی چولیں ہل گئیں۔ اس احتجاج کے اثرات صرف تیونس تک محدود نہ رہے بل کہ اطراف و جوانب کے ممالک تک بھی پھیل گئے۔ پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ اس قدر وسیع و عریض اور گہرے سمندر کی اکائی ایک قطرہ آب ہی تو ہے، جس نے آپس میں یک جا ہو کر اس قدر خوف ناک سمندر بنا دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو پوری دنیا کو غرقاب کر دے۔ خدارا! آئیے اور ''قطرۂ آب'' کی طرح متذکرہ تحریک سے جڑ جائیے، تاکہ اسے ''عملی سونامی'' میں تبدیل کیا جا سکے۔

ڈاکٹر غلام زرقانی

ایک نظر میں

نام : غلام زرقانی
قلمی نام: نامی دہلوی
پیدائش: جمشید پور، ۴ر جنوری ۱۹۶۸ء
والدگرامی: قائدِ اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ و الرضوان

تعلیم : انٹرمیڈیٹ آف سائنس — کریم سٹی کالج، جمشید پور
بی۔اے (اردو) — رانچی یونی ورسٹی
درس نظامی — دارالعلوم فیض الرسول، براؤں شریف
بی۔اے (اسلامیات) — کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ، لیبیا
دراسات علیا (علومِ قرآن) — کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ، لیبیا
ایم۔اے (عربی ادب) — جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
پی۔ایچ۔ڈی — جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
انفارمیشن ٹکنولوجی — بی۔سی۔آئی، ہیوسٹن

ذمہ داریاں: بانی وچیئرمین — حجاز فاؤنڈیشن آف امریکہ، ہیوسٹن، امریکہ
صدر ومہتمم — مدرسہ فیض العلوم، جمشید پور، انڈیا
امیر جامعہ — جامعہ حضرت نظام الدین اولیا، دہلی
سربراہِ اعلیٰ — مرکزی ادارہ شرعیہ، پٹنہ
مہتمم — اسلامی مرکز، رانچی
سرپرست — ضیاء الاسلام کولکاتا
سربراہِ اعلیٰ — جیلانی ایجوکیشنل ٹرسٹ، بلیا
صدر — تنظیم اہل سنت، جمشید پور
جنرل سکریٹری — رویت ہلال کمیٹی آف نارتھ امریکہ، امریکہ
مہتمم — باری مسجد، جمشید پور

مصروفیات: خطابت — جامع مکہ مسجد، ہیوسٹن، امریکہ
اسسٹنٹ پروفیسر — لون اسٹار کالج، ہیوسٹن، امریکہ
کالم نگاری — روزنامہ "انقلاب" دہلی وغیرہ
تدریس — حجاز انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ہیوسٹن
مدیر اعلیٰ — سہ ماہی "آیات" امریکہ وہند سے نکلنے والا جریدہ

مشاغل : درس وتدریس، تصنیف وتالیف، خطابت، شعروشاعری، ملی خدمات

قلمی خدمات: تقریباً پچاس سے زائد مقالات ومضامین اور تبصرے جو ہندوستان، امریکہ اور پاکستان کے رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

تصانیف

۱- فیضان القرآن (دل کش اُسلوب میں قرآنِ کریم کا ترجمہ بیانیہ)
۲- مساهمة غلام علی آزاد بلکرامی و اثرائه فی اللغة العربیة و آدابها (عربی)

3. ***Islamic Supplicatrion (Engllish)***
4. ***Essence of the Quran (English)***
5. ***Prophets in the Quran (English)***
6. ***Message of the Quran (English)***
7. ***Message of the Hadith (English)***
8. ***Fundamental Islamic Beliefs (English)***
9. ***Authentic Way of Prayer (English)***
10. ***Authentic Way of Fasting & Zakat (English)***
11. ***Authentic Way of Hajj & Umrah (English)***
12. ***Authentic Way of Marriage & Divorce (English)***
13. ***Authentically Recognized Halal & Haram (English)***

۱۴- حدیثِ دل (نعتیہ مجموعہ)

۱۵- علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ اور دعوتِ اسلامی

۱۶- فکر و نظر کے دریچے (عالم اسلام کے حوالے سے پچاس عنوانات پر تبصرہ و تجزیہ)

۱۷- پیغمبرِ انسانیت (مغربی مصنفہ کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب پر تنقید)

ترتیب، تخریج اور تقدیم

۱۸- تجلیاتِ رضا: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

۱۹- خطباتِ استقبالیہ: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

۲۰- فقہ، حدیث اور جہاد کی شرعی حیثیت: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

۲۱- عینی مشاہدات: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

۲۲- اظہارِ عقیدت: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

۲۳- بزبانِ حکایت: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

۲۴- شخصیات: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

زیر ترتیب

۱- الامن و العلیٰ کی تلخیص و تسہیل: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (مع اضافہ و تکمیل)

۲- تفسیر اُمّ القرآن: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (مع اضافہ و تکمیل)

۳- صدائے قلم: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (خطوط کا مجموعہ)

۴- افکار و نظریات: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (مقالات کا مجموعہ)

۵- مطالعہ دیوبندیت: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (مع اضافہ و تکمیل)

۶- علم و آگہی: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (ملی مسائل پر بے لاگ تبصروں کا مجموعہ)

زیر تصنیف

۷- حرفِ حکایت (سبق آموز واقعات)

۸- تفہیم خیالات (مقالات کا مجموعہ)

۹- فیضان القرآن (قرآن کریم کا ترجمہ بیانیہ ایک اچھوتے اسلوب میں)

۱۰- ضربِ قلم (اسلامیات پر مغربی مفکرین کے اعتراضات کا تعاقب)

۱۱- ***Days of the Prophet*** (انگریزی میں)

۱۲- سوزِ دل (نعتیہ کلام کا دوسرا مجموعہ)

مغربی مصنفہ، کیرن آرمسٹرانگ کی زہر میں ڈوبی ہوئی تحریر پر

بے لاگ تبصرہ

پیغمبر انسانیت

تصنیف

مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی

تقدیم

مفکرِ اسلام مولانا قمر الزمان اعظمی

والضحیٰ پبلی کیشنز، لاہور

"دارُالاسلام" کی شائع کردہ تراثِ علمیہ

1- المبین مع تنقید و تبصرہ   2- الرشاد   3- نُزْهَةُ الْمَقَال فِیْ لِحْيَةِ الرِّجَال

پروفیسر علامہ سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری سابق صدرِ شعبۂ علومِ اسلامیہ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

4- شَرْحُ الْمِرْقَاةِ لِشَمْسِ الْعُلَمَاءِ الْمَوْلَوِی مُحَمَّد عَبْد الْحَقِّ الْخَیْرَابَادِی

وَ یَلِیْه: رسالة فی الوُجُوْدِ الرَّابِطِی لِلسَّیِّدِ الحَکِیْم بَرَکَات اَحْمَد التُّوْنْکِی

5- ابحاثِ ضروری: حافظ ولی اللہ لاہوری، محشّی: مولوی فقیر محمد جہلمی، تحقیق: خورشید احمد سعیدی

6- الروض المجود (وحدۃ الوجود): علامہ محمد فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ، مترجم: حکیم سیّد محمود احمد برکاتی

7- علامہ فضل حق خیر آبادی؛ چند عنوانات: خوشتر نورانی (مدیر اعلیٰ ماہ نامہ "جامِ نور"، دہلی)

8- حیاتِ اُستاذ العلما مولانا یار محمد بندیالوی رحمۃ اللہ علیہ: علامہ غلامِ رسول سعیدی

9- مولودِ کعبہ کون؟: مولانا قاری محمد لقمان قادری

10- مَنْ هُوَ مُعَاوِيَه؟: مولانا قاری محمد لقمان قادری

11- اَلصَّلَاةُ وَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ الله: مولانا غلامِ دستگیر ہاشمی قصوری رحمۃ اللہ علیہ

12- توثیق صاحبین: فیصل خان رضوی

13- دفاعِ سیّدنا امیر معاویہ: شیخ حیات سندھی، عبدالعزیز پرہاروی، عبدالقادر بدایونی وغیرہم

14- افضلیتِ سیّدنا صدیق اکبر پر اجماعِ اُمت: فیصل خان رضوی

15- زبدۃ التحقیق کی روایات کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ: فیصل خان رضوی

16- رسائل مولانا خیر الدین خیوری دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (والدِ ابوالکلام آزاد)

17- مجلّہ "حجۃ الاسلام"/علامہ اشرف سیالوی نمبر

18- الثورة الهندية للامام فضل حق الخير ابادی، تحقيق: الدكتورة قمر النساء

19- فکر و نظر کے دریچے: ڈاکٹر مولانا غلام زرقانی

20- اِستشراق اور مستشرقین: ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی سباعی، مترجم: مولانا نور الحسن نعیمی

21- دیوانِ فضل حق خیر آبادی، دراسة و تحقیق: ڈاکٹر سلمہ فردوس سہول   زیرِ طبع

22- کلیاتِ کافیؔ: سلطانِ نعت گویاں حضرت مولانا سیّد کفایت علی کافیؔ مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ

ایک اِدارہ، ایک تحریک، ایک نظریہ

منشور

- گم گشتہ علمی و فنّی تراث کی بازیافت اور اُن کی جدید اشاعت
- اُردو زبان و ادب کے اِرتقا میں صوفیہ و علما کی تخلیقات کو زندہ کرنا
- تحقیقی مقالات کی تیاری میں تعاون کرنا اور ان کو منظرِ عام پر لانا
- جدید مسائل کا متوازن حل اِسلامی نقطۂ نظر سے دنیا کے سامنے پیش کرنا
- نظامِ خلافت کے پیام کا پرچار کرنا اور اس کے نفاذ کے لیے ہمہ گیر جدوجہد کرنا
- سامراجی قوتوں کے خفیہ عزائم کو افشا کرنا اور ان کے مقابل دفاعی پالیسی مرتب کرنا
- اِسلام کے خلاف میڈیائی یلغار کے مقابلے میں غیر متزلزل رکاوٹیں کھڑی کرنا
- وحدتِ اُمت کے لیے افرادِ ملت کی فکر و فہم کے راستے ہموار کرنا
- مستشرقین کی اِسلام دشمن تحقیقات کو حقائق کی میزان میں پرکھنا
- نظریۂ پاکستان کا پیغام عام کرنا، نیز اس کے نئے اور پرانے مخالفین کو بے نقاب کرنا
- نظریاتی تخریب کاری، غیر علمی مزاج اور فکری تحکم کا استیصال کرنا
- سیکولرازم، جدیدیت اور جمہوریت کی بطالت اور سفاہت کو آشکار کرنا

دارُالاِسلام

C-8 پہلی منزل محی الدین بلڈنگ، داتا دربار مارکیٹ، گنج بخش روڈ، لاہور

0321-9425765

darulislam21@yahoo.com